سو تاریخی واقعات
فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - پشاور - حیدرآباد - کراچی
مؤلفہ
غلام رسول مہر

سو تاریخی واقعات

تہذیب کے ابتدائی زمانے سے لے کر موجودہ عہد تک
اِنسان کی سرگزشت کی چند اہم ترین جھلکیاں

تحریر:- ولیم اے - ڈیوٹ
ترجمہ بہ اضافۂ ابواب:- غلام رسول مہر

فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور — راولپنڈی — پشاور — حیدرآباد — کراچی

فہرستِ مضامین

(انگریزی سے مُنتخب اور مترجمہ حصّہ)

فہرستِ مضامین

(اُردو میں خود نوشتہ ابواب)

تمہید

تاریخ بہادری، اُولوالعزمی اور خدمتِ انسانیت کے عظیم الشّان کارناموں سے لبریز ہے۔ ان میں جوش و ہیجان اور ولولہ افروزی کے وہ تمام سامان موجود ہیں، جن کے لیے دُنیا طالع آزماؤں کے خیالی یا حقیقی افسانوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ تاہم ظاہر ہے کہ ان کارناموں سے مُستفید ہونے کی غرض سے ہر شخص تاریخی دفتروں کی ورق گردانی کے لیے وقت نہیں نکال سکتا اور تاریخوں میں بڑے بڑے کارناموں کے علاوہ قوموں اور معاشروں کی زندگی کے عام پہلوؤں پر بھی مفصّل بحثیں کی جاتی ہیں۔ غرض کہ کام اتنا مشکل اور زحمت خیز ضرور ہے جیسے موتی نکالنے کے لیے سمندر میں غوطہ زنی۔

جن اصحاب کو تعلیم و تربیت کے انتظامات میں خاص بصیرت حاصل ہے، ان کے نزدیک تاریخ کا ذوق پیدا کرنے کی ایک صُورت یہ بھی ہے کہ ایسے واقعات چُن لیے جائیں جن سے انسانیت کے چھوٹے یا بڑے طبقوں پر گہرا اثر پڑا ہو۔ ان کی تقدیریں بدلی ہوں، ان کے فکر و نظر میں تغیّر پیدا ہُوا ہو، ان کی زندگی کا دھارا نئے رُخ پر بہنے لگا ہو۔ پھر انھیں اختصاراً پیش کر دیا جائے، تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو زیادہ دِقّت اور محنت صرف کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے اور وہ ہر واقعے کی رُوح و معنویت کو اپنے اندر جذب کر لیں۔

اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ لوگوں میں تاریخ کے مطالعے کا شوق ترقّی کرے گا، اس مضمون سے دلچسپی بڑھے گی اور وہ مختصر کہانیوں سے رُوشناس ہو کر زیادہ مفصّل داستانوں کی طرف متوجّہ ہو جائیں گے۔ اگر یہ نہ بھی ہو تو واقعات کے مختصر مرقّع کا مطالعہ اُنھیں اِتنا تو بتا دے گا کہ انسانیت آغاز سے اب تک کس راستے پر چلتی رہی۔ اُسے کون کون سے بڑے مرحلے پیش آئے اور ترقّی و پیش قدمی کی عام رفتار کیا تھی۔ عوام کے لیے اتنا علم بھی ہر لحاظ سے حد درجہ قیمتی ہے۔

مسٹر ولیم اے ڈی وٹ نے تاریخ عالم میں سے ایک سو اہم واقعات اسی غرض سے چُنے تھے اور پُورا اہتمام کیا تھا کہ انسانی سرگرمیوں کے تمام دائروں سے ضروری چیزیں لے لی جائیں، تاکہ کتاب ہر لحاظ سے جامع بن جائے۔ اگرچہ اُنھوں نے انتخاب میں متعدّد افراد اور اداروں سے بھی مدد لی، تاہم یہ انتخاب زیادہ تر مغربی اقوام کی سرگزشت تک محدود رہا اور مشرق کی تاریخ پر بہت کم توجہ فرمائی گئی۔

پیشِ نظر کتاب میں پچاس واقعات مسٹر ڈی وٹ کی کتاب سے لیے گئے ہیں اور پچاس واقعات

مشرقی، خصوصاً مسلمانوں کی تاریخ سے منتخب کیے گئے ہیں۔ کوشش یہی رہی کہ جو واقعات لیے جائیں وہ کسی نہ کسی نقطہ نگاہ سے خاص اہمیت رکھتے ہوں۔ ان سے انسانوں کے کسی طبقے پر گہرا اثر پڑا ہو یا پڑ سکتا ہو، نیز وہ سبق آموز ہوں اور ان کے مطالعے سے تاریخی ذوق میں بالیدگی پیدا ہو لیکن جیسا کہ مسٹر ڈی وٹ اعتراف کر چکے ہیں، انتخاب کے سلسلے میں کوئی ایسا معیار پیش کرنا مشکل ہے جو ہر نگاہ اور ہر مذاق کے لیے باہمہ وجوہ اطمینان بخش ہو۔ تاہم ملاحظے سے واضح ہو جائے گا کہ انتخاب میں حتی الامکان ان مقاصد کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے جو کتاب کی ترتیب و تالیف کے محرک ہوئے اور اپنی ناچیز بساط کے مطابق انداز بیان بھی ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ واقعات کی روح و معنویت کا ضروری گوشہ پوری طرح اُجاگر ہو جائے۔ یہ کتاب طلبہ کے لیے خصوصاً بے حد مفید ہے اور ترتیب و تحریر میں طلبہ ہی کا معیار پیش نظر رہا ہے۔

امید ہے کہ یہ تمہیدی الفاظ اس مرقعے کی حقیقی حیثیت بخوبی واضح کر سکیں گے۔ باقی رہا اصل مُرقّع تو اس میں جو کچھ ہے وہ ایک نظر ملاحظہ فرما لینے کے بعد ہی آشکارا ہو سکے گا۔

مجھے مُسرّت ہے کہ مکتبۂ فرینکلن نے اپنی یہ کتاب اشاعت کے لیے میسرز فیروز سنز جیسے تجربہ کار اور خوش ذوق ناشرین کے حوالے کی ہے جنھوں نے کاغذ، طباعت اور تصویر کی عمدگی کا خاص اہتمام کر کے اردو کتاب کو انگریزی کتابوں کے درجے تک پہنچانے کی قابلِ تعریف کوشش کی ہے۔

ادارہ ہر طرح سے حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

بنی اسرائیل غلامی سے نجات پاتے ہیں

بنی اسرائیل لمبی مدّت غلامی میں گزار چکنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی رہنمائی میں مصر سے نکلے اور ارضِ موعُود (فلسطین) کے لیے پُر آشوب سفر شروع کیا، جس میں دردناک واقعات بھی پیش آئے اور اُنھوں نے دلیری کے کارنامے بھی انجام دیئے۔ یہ سفر بنی اسرائیل کی عام سرگزشت کا آئینہ تھا۔ آخر کار وہ ارضِ موعُود میں پہنچ گئے۔ مصر سے نکلنے پر بنی اسرائیل کی قومی اور مذہبی روایات کا آغاز ہوا۔ توریت بتاتی ہے کہ اس سفر میں خدا نے حضرت موسیٰؑ کی قوم سے وہ عہد لیا تھا جسے مذہبی نوشتوں میں میثاق کہا گیا۔ یہ واقعہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس سفر میں حضرت موسیٰؑ خدا کی طرف سے دس احکام لائے تھے۔ جن کے اخلاقی اثر کی لہریں روئے زمین کے ہر حصّے میں پہنچیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام مصر میں پیدا ہوئے اور حضرت اسرائیل (یعقوبؑ) کی اولاد میں سے تھے۔ اس زمانے میں مصر کے بادشاہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اُسے فوراً موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے، صرف لڑکیوں کو زندہ چھوڑا جائے۔ خدا جانے کتنی معصوم ہستیاں دُنیا میں قدم رکھتے ہی موت کی گود میں پہنچا دی گئیں۔ حضرت موسیٰؑ اس لیے بچ گئے کہ پیدا ہوتے ہی انھیں سرکنڈوں کی ایک ٹوکری میں رکھ کر دریائے نیل میں بہا دیا گیا تھا فرعون کی بیوی نے یہ ٹوکری دیکھی تو دریا سے نکلوائی اور بچّے کو اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ یُوں قدرت نے حضرت موسیٰؑ کے لیے شاہی دربار کی شان و شوکت میں پروان چڑھنے کا موقع پیدا کر دیا۔

حضرت موسیٰؑ جوان ہوئے تو ایک دن آپ نے دیکھا کہ ایک مصری ایک اسرائیلی کو پیٹ رہا ہے۔ حضرت نے مصری کو ظلم سے روکنا چاہا، لیکن وہ باز نہ آیا۔ اس پر آپ نے ایک گھونسا رسید کیا اور وہ مصری وہیں گر کر مر گیا۔ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا، لیکن اس کا عام چرچا ہوا۔ اب حضرت موسیٰؑ نے یہی مناسب سمجھا کہ مصر سے نکل جائیں۔ چنانچہ ایک صحرائی علاقے

میں حضرت شعیبؑ کے پاس چلے گئے۔ ایک مدت تک وہاں ریوڑ چراتے رہے۔ حضرت شعیبؑ نے اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی۔ پھر ایک پودے سے آگ نکلنے کا واقعہ پیش آیا اور حضرت کو بشارت ملی کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات دلائیں گے۔ چنانچہ وہ اس مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے مصر واپس چلے گئے۔

مصر میں پہنچ کر انھوں نے اپنے بھائی ہارونؑ کی امداد سے بنی اسرائیل کو جمع کر لیا۔ انھیں غلامی کی زندگی سے نجات دلانے کی صرف ایک صورت تھی کہ مصر سے نکال کر ان کے اصل وطن، یعنی فلسطین پہنچا دیا جاتا، لیکن فرعون نہ تو بنی اسرائیل کو ذلت کی زندگی سے نجات دینے کے لیے تیار تھا اور نہ انھیں مصر سے جانے کی اجازت دیتا تھا۔ جب خدا کے حکم سے ان پر یکے بعد دیگرے دس وبائیں نازل ہوئیں تو فرعون نے مجبور ہو کر اجازت دے دی۔ جب بنی اسرائیل روانہ ہوئے تو فرعون کی نیت پھر بدل گئی۔ اس نے لاؤ لشکر لے کر بنی اسرائیل کا تعاقب کیا اور ان کے پیچھے پیچھے بحیرۂ قلزم کے کنارے پہنچ گیا، تاکہ انھیں روکے۔ یکایک خدا کی قدرت سے ایسی ہوائیں چلیں کہ سمندر میں راستہ پیدا ہو گیا اور بنی اسرائیل سلامتی کے ساتھ پار چلے گئے، لیکن جب فرعون ان کے پیچھے پیچھے چلا تو سمندر کا پانی مل گیا اور وہ لاؤ لشکر کے ساتھ ڈوب گیا۔

مصر سے باہر نکل آنے پر بھی بنی اسرائیل کی آزمائش کا دور ختم نہ ہوا۔ وہ ایک نسل تک صحرا میں سرگرداں پھرتے رہے۔ ان کے درمیان اختلافات بھی پیدا ہوئے، مگر خدا کے ساتھ جو عہد ہو چکا تھا، اس کی پابندی اور حضرت موسیٰؑ کے لائے ہوئے احکام کی پیروی نے بے خانماں بنی اسرائیلیوں کا شیرازہ بکھرنے نہ دیا۔

حضرت موسیٰؑ نے دریائے اردن کے کنارے ایک پہاڑ پر وفات پائی۔ اس وقت تک بنی اسرائیل ارض موعود میں داخل نہ ہوئے تھے، لیکن حضرت موسیٰؑ اس پر مطمئن تھے کہ ان کی قوم میں مصیبتوں اور آزمائشوں کو صبر سے برداشت کر لینے اور ایمان پر قائم و استوار رہنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔ انھیں خصوصیتوں کو قومی زندگی کے جوہر سمجھا جاتا ہے۔

چنانچہ بنی اسرائیل حضرت یوشع کی سرداری میں مشرق کی جانب سے فلسطین میں داخل ہوئے۔ دریائے اردن کو عبور کر کے انھوں نے یریحو کو فتح کیا جو فلسطین کا مشرقی قلعہ تھا، پھر پورا فلسطین ان کے قبضے میں آ گیا۔

سائرس بابل پر قابض ہوتا ہے

زمانۂ قدیم میں بحیرۂ رُوم کے آس پاس تین بڑی تہذیبوں نے نشوونما پائی: ایک مصری تہذیب، دُوسری ہِٹّی تہذیب اور تیسری دوآبہ دجلہ وفرات (عراق) کی تہذیب، جو سب سے زیادہ پُرانی تھی۔ اس تہذیب کا آخری بڑا مرکز بابل تھا، جس کی سلطنت کا نیا دَور تینوں کی بربادی کے بعد شروع ہوا۔ بابل کے بہادر سپاہی بارہا حملہ آوروں کے سَیل کا رُخ پلٹ چکے تھے۔ اکتوبر ۵۲۹ ق م میں ان کی مرکزی حکومت کو جنگ کے بغیر سائرس کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

سائرس نے میڈیا اور پارس کو متّحد کر کے جس بادشاہی کی بُنیاد ڈالی، وہ اس تیزی سے اُبھری کہ بابل کے بادشاہ نابونی دس کو اس کا صحیح اندازہ ہی نہ ہوسکا۔ ابتدا میں وہ خوش تھا کہ میڈیا کی بادشاہی ختم ہوگئی جو مُدّت سے اس کی دُشمن چلی آتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نئی قوّت کو زک دینا مشکل نہ ہوگا۔ اس نے مصر، لیڈیا، سپارٹا وغیرہ کو ملا کر مقابلے کے لیے ایک متّحدہ محاذ بھی قائم کر لیا تھا، لیکن متّحدہ ایرانی قبائل نے بابل کے تمام حلیفوں کو آناً فاناً درہم برہم کر ڈالا۔ سائرس نے ۵۴۱ ق م میں لیڈیا کو فتح کیا۔ پھر بحیرۂ رُوم کے کنارے کی تمام یونانی نوآبادیاں لے لیں۔ نابونی دس نے بھی بابل کے شمال میں شکست فاش کھائی۔ اس کے بعد بابل والوں کے لئے مقابلے کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ چنانچہ اُنھوں نے ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر حوالگی قبول کر لی۔ بے شک قتل و آتش زنی کے وہ واقعات پیش نہ آئے، جو ڈیڑھ سو سال قبل نینوا کے بادشاہ سنخیرب کے ہاتھوں پیش آ چکے تھے۔ شہر تباہی کے زخموں سے محفوظ رہا، مگر اس کی عظمت ماضی کا افسانہ بن کر رہ گئی۔

اہل بابل نہایت قابل اور گرمجوش تھے۔ ان کے فنونِ لطیفہ کا اثر مصر تک پہنچا۔ علمِ ہندسہ میں ان کے کمالات اعلیٰ درجہ کی قلعہ بندیوں اور آبیاری کے وسیع

سلسلوں میں نمایاں تھے۔ فنِ تعمیر میں ان کی برتری کی شہادت عالی شان مندروں سے ملتی تھی۔ انھیں کاروبار میں بھی بلند درجہ حاصل تھا۔ ان کے بعض تجارت پیشہ خاندان قصبوں اور شہروں میں اقتدار کے جال بچھائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے ادبیات کی حوصلہ افزائی کی۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے ایک ہزار سال پیشتر کتب خانوں کی بُنیاد رکھی۔ سن عیسوی سے دو ہزار سال پہلے حمورابی نے بابل میں ایک عظیم الشّان سلطنت قائم کی اور وہ مجموعۂ قوانین جاری کیا جس نے عالمگیر شہرت پائی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس مجموعۂ قوانین میں مختلف جُرموں کے لیے جُرمانے، جلاوطنی، بلکہ دردناک موت تک کی سزائیں درج تھیں، لیکن سزائے قید کے لیے کوئی دفعہ نہ رکھی گئی تھی۔

دوآبہ دجلہ و فرات کے سپاہی بھی بڑے دلیر اور ہُنرمند تھے۔ ان کے پاس منجنیقیں تھیں۔ وہ قلعہ بندیوں کو سُرنگیں لگا کر اُڑا دیتے تھے۔ سڑکیں اور پُل بنانا جانتے تھے اور نویں صدی قبل مسیح میں اُنھوں نے رسالہ بھی تیار کر لیا تھا، لیکن سائرس نے سوار تیر اندازوں کے ایسے لشکر تیار کر لیے، جن کا مقابلہ کوئی نہ کر سکتا تھا۔ بابل کے رسالے بیکار ہو کر رہ گئے اور پیادہ فوج لڑائی میں سرگرم حصّہ لینے سے پیشتر ہی تباہ ہو گئی۔

بابل کے علاوہ سائرس نے شام، فلسطین، مشرقی ایران، قبرص اور ایشیائے کوچک کے آس پاس کے تمام یونانی جزیرے مسخّر کر لیے اور پھر ۵۱۹ ق م میں ایران پُوری مہذب مغربی دُنیا کا مالک بن گیا۔ اولوں کی طرح تیر برسانے اور آندھی کے مانند تیز چلنے والے سواروں نے ایک روشن دماغ سپہ سالار کی ماتحتی میں اس سلطنت کی طرح ڈالی، جو اس دُنیا میں غالباً پہلی شہنشاہی تھی۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اہلِ ایران لڑائیوں میں بھی بڑے ضبط سے کام لیتے تھے اور مفتوحین کے ساتھ ان کا برتاؤ بھی اچھا تھا۔ وہ دُوسرے مذاہب سے رواداری برتتے اور مفتوحہ ملکوں کے باشندوں کو اُونچے عہدے دیتے۔ عوام کی مادی بہبود کا خاص خیال رکھتے اور ظالمانہ ٹیکس نہ لگاتے۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ دُنیا کو ایک مرکز پر جمع کر دیا جائے اور سب کے ساتھ اچّھا سلوک کیا جائے۔ اس وسیع سلطنت کے باشندوں میں ایرانی قومیّت کے ذریعے سے عالمی احساس پیدا ہُوا۔ ان سے پیشتر بابل، مصر اور ہٹیوں کی فتوحات کا مقصد لُوٹ مار کے سوا کچھ نہ تھا۔

مہاتما بُدھ کو نروان حاصِل ہوتا ہے

اہل سیلون کا دعویٰ ہے کہ ان کے پاس دُنیا کا سب سے زیادہ پُرانا درخت موجود ہے۔ یہ اسی درخت کی شاخ کاٹ کر لگایا گیا تھا جس کے نیچے سدھارتھ گوتم بُدھ کو عرفان کی روشنی ملی تھی اور اس نے بُدھ، یعنی بہت بڑے عارف کا لقب حاصل کیا تھا۔ وہی روشنی بُدھ دھرم کی رُوحِ رَواں بن گئی۔

سدھارتھ گوتم (غالباً چھٹی صدی قبل مسیح میں) اس گھرانے میں پیدا ہُوا جس میں دولت کی ریل پیل تھی اور عیش و راحت کے تمام سامان موجود تھے۔ شادی کو نو سال گزر چکے تھے اور ایک بچّہ بھی پیدا ہو چکا تھا، جب اس کے دل میں دُکھیا انسانیت کے لیے دردمندی کا جذبہ بیدار ہُوا اور زندگی کی گہری حقیقتیں دریافت کرنے کی طلب پیدا ہوئی۔ وہ گھر بار چھوڑ کر ان رِشیوں اور مُنیوں کے پاس پہنچا جو دُنیا سے الگ تھلگ پہاڑوں کی تنہائی میں زندگیاں گزار رہے تھے۔ یہ رشی اور منی علم اور نروان کی تلاش میں برت رکھتے، کڑی ریاضتیں کرتے، اپنے جسموں کو زیادہ سے زیادہ مشقتوں میں ڈالتے۔ گوتم نے ان کے تمام طور طریقے آزما دیکھے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ لوگ بھی سچائی کا راستہ گم کیے بیٹھے ہیں۔

انھیں چھوڑ کر وہ جگہ جگہ سرگرداں پھرتا رہا۔ آخر دریا کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہیں زندگی کی حقیقت ایک روشنی کی شکل میں اس کے سامنے نمودار ہوئی۔ بنارس میں اسے چیلوں کی ایک جماعت مل گئی، جن کی مدد سے اس نے ہندوستان کے طول و عرض میں اپنی تعلیمات پھیلائیں۔

اگرچہ بُدھ دھرم پُورے ہندوستان کو ہندویت سے نہ چھین سکا، تاہم برما، سیلون، کمبوڈیہ، تھائی لینڈ، چین اور جاپان کے بے شمار لوگ گوتم کے پیرو ہیں۔ اس کی علیمی، نیز زندگی اور عقائد کی پاکیزگی نے کروڑوں انسانوں کو متاثر کیا ہے۔

مہاتما بُدھ نے درمیانی راستہ سکھایا، یعنی نہ تو انسان کو نفسانی خواہشوں کا غلام بن جانا چاہیے اور نہ یہ کہ خواہشوں کو بالکل مار دیا جائے، بلکہ ان پر قابو پانا چاہیے۔ اس نے چار سچائیوں کی تعلیم دی۔ وہ کہتا ہے کہ رنج اور دُکھ اول تسکین نفس کی خواہش، دوم مادّی فائدوں کی خواہش اور سوم بقائے دوام کی خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ چوتھی سچائی یہ ہے کہ انسان رنج اور دُکھ سے پاک ہو کر رُوح کی تسکین کے لیے صحیح اصول اور صحیح اعمال کو اپنائے۔ اسی کے لیے اس نے "نروان" کی اصطلاح استعمال کی۔

دُنیا میں پہلی جمہوریت قائم ہوتی ہے

حضرت مسیح علیہ السلام سے پانسو دس سال قبل یُونان کی مشہور ریاست ایھنز کا مطلق العنان حاکم ہپیاس[1] وطن چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا اور دُنیا میں پہلی بڑی جمہوری حکومت نے جنم لیا۔

حکیم سولن نے ۵۹۴ ق م میں ایتھنز کے لیے جو دستورِ حکومت بنایا تھا وہ کھیتی باڑی اور کاروبار کرنے والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا لیکن سیاسی اختیارات پُرانے اُمرا ہی کے قبضے میں رہے۔ اس سے ان کے درمیان کھینچ تان اور کشاکش نے ایسی صُورت اختیار کر لی کہ لوگ تنگ آ گئے۔ جب ۵۶۰ ق م میں تمام معاملات کی باگ ڈور ہپیاس کے باپ کو سونپی گئی تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس انتظام کے تحت ایتھنز خوشحال ہو گیا۔ اس کی مالی حالت بہتر ہو گئی لیکن ایک شخص کی مختاری کب تک گوارا کی جاتی؟ اُمرا میں سے کلیس تھینز[2] نام ایک شخص نے انقلاب کا پرچم اُٹھایا اور مطلق العنانی کا دور ختم کر دیا۔ اب کلیس تھینز ہی کو نئی حکومت کا ڈھانچا استوار کرنے کا ذمہ دار بنایا گیا۔ اس کے سامنے دو ضروری کام تھے: اوّل یہ کہ امرا کی طاقت پر قابو پانے کا بندوبست کرے، دُوسرے یہ کہ آیندہ مطلق العنانی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑے۔

اُمرا کی قوت تو پہلے ہی گھٹ چکی تھی، اس پر تجارت کے پھیلاؤ اور کلچر کی اشاعت نے قومیت کا احساس اس درجے پر پہنچا دیا کہ خاندان اور قبیلے کے رشتے خاصے کمزور ہو گئے۔ کلیس تھینز نے شہری حقوق کا دائرہ وسیع کر دیا۔ تجارتی طبقے اور آزاد کیے ہُوئے غلام بھی ان حقوق سے شادکام ہُوئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ رائے دہی کے لیے قصبوں اور ضلعوں کے حلقے بنا دیئے۔ اس طرح پُرانی قبائلی تقسیم کی پہلی حیثیت باقی نہ رہی اور اس کی جگہ نئے اجتماعات نے لے لی۔

اور بھی کئی نئے انتظامات وجود میں آئے۔ بہرحال کلیس تھینز نے درمیانی طبقے کے لوگوں کو

---

[1] Hippias
[2] Cleisthenes

رائے دہی کا زیادہ حق دار قرار دیا اور ایتھنز کے نظم ونسق میں ایسی تبدیلی کر دی کہ رائے دہی نے قابلِ توجہ حیثیت اختیار کر لی۔ لیکن اس کے باوجود غلامی باقی رہی اور غلاموں کو نئے جمہوری نظام میں شامل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔

مطلق العنانی کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے ایک عجیب طریقہ تجویز کیا گیا، یعنی وقتاً فوقتاً شہریوں سے رائے لی جاتی کہ آیا کوئی شخص اتنے اثر ورسوخ کا مالک تو نہیں بن گیا جو ریاست کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتا ہو! جس شخص کو کم از کم دس ہزار شہری خطرناک قرار دیتے، اسے دس سال کے لیے جلاوطن کر دیا جاتا، لیکن نہ اُسے غدّار سمجھا جاتا، نہ مجرم۔ جب وہ مقررہ مُدّت پوری کر کے لَوٹتا تو اسے جائداد اور تمام شہری حقوق واپس مل جاتے۔ ابتدا میں اس قاعدے کو بڑی احتیاط سے استعمال کیا جاتا تھا، مگر بعد میں یہ بگڑتے بگڑتے سیاسی گروہ بندی کا انتقامی حربہ بن گیا اور پانچویں صدی عیسوی میں منسوخ ہُوا۔ اگرچہ یہ جمہوری حکومت کا بالکل ابتدائی خاکہ تھا، لیکن تاریخ میں نئے دَور کا سنگِ میل ثابت ہُوا اور ایک ہزار سال سے زیادہ مدّت تک قائم رہا۔ آخر ایتھنز کی نوآبادیاں چھن گئیں، اس کی تجارت اور دولت ختم ہو گئی، بحیرۂ رُوم کی دُوسری طاقتیں اثر واقتدار میں منزلوں آگے نکل گئیں، لیکن جمہوریہ ایتھنز کی عظمت کا احترام سب کے دلوں میں قائم رہا اور آج بھی دُنیا اسی شمع کی طرف لپکی چلی جا رہی ہے جو ایتھنز نے ڈھائی ہزار سال پیشتر روشن کی تھی۔

یونان سے دُنیا نے علوم وفنون سیکھے اور ہم اب تک جتنی تاریخی معلومات حاصل کر سکے ہیں۔ ان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ پہلا جمہوری نظام بھی یونان ہی میں قائم ہُوا تھا، مگر وہ بالکل ابتدائی خاکہ تھا اور اس لحاظ سے صحیح جمہوری نظام قرار نہیں دیا جا سکتا کہ یونان میں بسنے والے تمام لوگوں کو یکساں حقوق حاصل نہ تھے۔ صحیح اور حقیقی جمہوریت وہی ہو سکتی ہے جس میں سب لوگوں کا درجہ یکساں ہو۔ دیکھیں دُنیا اس نصبُ العین پر کب پہنچتی ہے اور بڑی طاقتوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے جو تسلّط قائم کر رکھا ہے، وہ کب ختم ہوتا ہے۔

کنفیوشس مثالی حکمران کی تلاش میں نکلتا ہے

مشہور چینی حکیم کنفیوشس دُنیا کے بہت بڑے داناؤں اور بزرگوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ پانچویں صدی قبل مسیح کے آغاز میں ایک ایسے شخص کی تلاش میں اپنے وطن سے (لُو، صوبہ شانتنگ) سے نکلا جو اس کے بتائے ہُوئے اصُول کے مطابق حکمرانی کے فرائض انجام دینے کے لیے تیار ہو۔ اس وقت کنفیوشس کی عمر پچپن سال کی تھی۔ وہ تیرہ برس اپنے دیس سے باہر رہا۔ دُنیا کی سیاسی تاریخ میں جلاوطنی کا یہ ایک نہایت ہی عجیب اور حد درجہ نتیجہ خیز واقعہ ہے۔

کنفیوشس ان تیرہ برس میں جن جن حکمرانوں سے ملا، ان سب نے آؤبھگت میں تو کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، لیکن حکمرانی کے جو طور طریقے اس زمانے میں رواج پا چُکے تھے، اُنھیں چھوڑنے کی حامی کسی نے بھی نہ بھری۔ گویا کنفیوشس کی تلاش بالکل ناکام رہی، لیکن حقیقت پر نظر رکھی جائے تو یہ ناکامی عالم انسانیت کے لیے عموماً اور اہلِ چین کے لیے خصوصاً بہت بڑی برکت کا باعث ہوئی۔ اس نے سیاسیات کے متعلق کنفیوشس کے دل میں بیزاری پیدا کر دی اور زندگی کے آخری دَور میں وہ اس کام کے لیے وقف ہو گیا جس سے ان گنت انسانوں کو فائدہ پہنچا اور خود اسے بھی شہرتِ عام، بلکہ بقائے دوام حاصل ہو گئی۔

کنفیوشس کے والدین اتنے غریب تھے کہ اس کے لیے تعلیم کا کوئی انتظام نہ کر سکتے تھے، مگر اس کا شوقِ علم ہر مشکل سے عہدہ برآ ہوتا رہا۔ بائیس سال کی عمر تک وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ ایک درسگاہ جاری کر سکے، جس کی طرف قوم کے اکثر ممتاز نوجوان

کھنچے چلے آتے تھے۔

عمر کی پختگی کے ساتھ اس کے سیاسی نظریات بھی نشوونما پاتے رہے۔ آخر اس نے معلوم کر لیا کہ حکمرانی کے اختیارات کیونکر استعمال کرنے چاہئیں اور عوام کے ساتھ تعاون کے صحیح طریقے کیا ہیں۔

اس کی عمر باون سال کی تھی جب اسے چینگٹو کا سب سے بڑا حاکم بنا دیا گیا۔ اس کے لیے اپنے اصُول کے عملی تجربے کا یہ نہایت اچھا موقع تھا۔ چنانچہ نتیجہ حیرت انگیز نکلا۔ عوام کے طور طریقے تھوڑی ہی مُدّت میں کامل اصلاح پا گئے۔ بعدازاں وہ وطنی ریاست میں محکمہ جرائم کا وزیر بنا تو جرائم کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ عام لوگ اس کی انتہائی عزت کرنے لگے۔

ہمسایہ حکومتوں کو خوف پیدا ہوا کہ اگر کنفیوشس کا اصلاحی نظام اسی طرح کامیاب رہا تو وہ سارے ملک کا حاکم بن جائے گا، لہٰذا اُنھوں لُو کے باشندوں کو اصلاح کے راستے سے ہٹانے اور کنفیوشس سے برگشتہ کرنے کی سرگرم کوششیں شروع کر دیں۔ یہ کوششیں بارآور ہوئیں۔ لوگ اپنے مایۂ ناز حکیم کی تعلیمات سے غفلت برتنے لگے اور کنفیوشس دیس کو چھوڑ کر باہر نکل جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

تیرہ سال باہر گزار کر لَوٹا تو اس کی خدمت میں بڑے بڑے عہدے پیش کیے گئے، لیکن اس نے ہر پیشکش ٹھکرا دی اور الگ تھلگ بیٹھ کر تعلیم دینے یا کتابیں لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ریاست 'لو' ان برکتوں سے محروم ہو گئی جو کنفیوشس کی حکمرانی میں اسے حاصل تھیں، لیکن اس نقصان کے بدلے میں چین ہی کو نہیں، بلکہ ساری دُنیا کو فلسفہ و حکمت اور تاریخ و ادب کی بیش بہا دولت مل گئی۔ چین میں ڈیڑھ ہزار سال پیشتر تک جو کچھ ہوتا رہا تھا، کنفیوشس نے وہ سب کچھ مرتّب کر دیا۔ اگر یہ کام انجام نہ پاتا تو دُنیا ان حالات سے بالکل بے خبر رہتی۔

کنفیوشس نے آسمانی الہام کا دعویٰ کبھی نہ کیا۔ وہ افراد اور معاشرے کو فضائل اخلاق سکھاتا تھا۔ اس کی حکیمانہ باتیں کروڑوں چینیوں کی نوکِ زبان پر ہیں اور انھیں چین کی بہت قیمتی علمی میراث سمجھا جاتا ہے۔

میراتھان میں یُونان شاندار فتح حاصل کرتا ہے

میراتھان یونان کا ایک چھوٹا سا میدان ہے جو صرف پانچ میل لمبا اور دو میل چوڑا ہے۔ اس کے ایک طرف سمندر ہے اور باقی تین طرفوں کو پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ ۴۹۰ ق م کے موسم بہار میں اسی مقام پر ایرانیوں اور یونانیوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں ایرانیوں نے تعداد میں چھ گنا ہونے کے باوجود شکست کھائی۔

جب ایران کے شہنشاہ دارا گشتاسپ کی فتوحات کا سکّہ ایشیا میں رواں ہو چکا تو اس نے یونان کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا جو اس زمانے میں اوجِ شہرت پر پہنچا ہُوا تھا۔ اس نے اپنے ایک سپہ سالار کو چھ سو جہازوں کا بیڑا، چالیس ہزار سے ساٹھ ہزار تک سوار اور بے شمار پیادہ فوج دے کر یونان بھیجا۔ ایرانی جہاز میراتھان میں لنگر انداز ہوئے، جہاں سے ایتھنز تک دو راستے جاتے تھے اور فاصلہ بائیس میل سے زیادہ نہ تھا۔

جو یونانی فوج مقابلے میں آئی، وہ دس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ایرانی میراتھان کے میدان میں خیمہ زن ہُوئے اور یونانی آس پاس کے پہاڑوں پر چھپے بیٹھے تھے۔ ایرانی سپہ سالار نے چند روز تک کوئی حرکت نہ کی لیکن جب اس نے دیکھا کہ لڑتے بھڑتے ہُوئے بائیس میل کا پہاڑی راستہ طے کر کے ایتھنز پہنچنا مشکل ہو گا تو بیس ہزار سپاہ کو میراتھان میں چھوڑا اور باقی کو جہازوں پر سوار کرا کے ایک اور بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گیا جو ایتھنز سے بہت قریب تھی۔

اب یُونانیوں نے فیصلہ کر لیا کہ ایرانیوں پر حملہ بول دینا چاہیئے۔ یُونانی سپہ سالار ملٹیاڈیز نے لڑائی کا جو منصوبہ تیار کیا اس سے بعد ازاں بڑے بڑے سپہ سالار کام لیتے رہے۔ یونانیوں کے پاس بڑی بڑی ڈھالیں اور لمبے لمبے نیزے تھے۔ ملٹیاڈیز نے دائیں اور بائیں بازو کو خوب مضبوط کر لیا اور قلب

کو کمزور رکھا۔ لڑائی شروع ہوئی تو ایرانیوں نے قلب ہی پر حملہ کیا، جو پیچھے ہٹا اور ایرانی آگے بڑھے۔ اس اثنا میں یونانی فوج کے بازوؤں نے پوری ایرانی فوج کو نرغے میں لے لیا اور قتل عام شروع کر دیا۔ چھ ہزار چار سو ایرانی کھیت رہے، باقی بھاگ کر جہازوں پر سوار ہو گئے۔ اب یونانی تیزی سے کوچ کرتے ہوئے ایتھنز کے سامنے پہنچ گئے، تاکہ ایرانیوں کے نئے حملے کی روک تھام کر سکیں۔ ایرانی سپہ سالار نے یہ مستعدی دیکھی تو لنگر اُٹھائے اور واپس چلا گیا۔ دس سال میں مزید تیاری کر کے پھر ایک بیڑا یونان آیا جس نے سیلمس کی جنگ میں یونانیوں سے شکست کھائی۔

ایک چھوٹے سے ملک کا بہت بڑی سلطنت کے مقابلے میں یوں کامیابی حاصل کرنا بجائے خود بہت بڑا واقعہ ہے، لیکن میراتھان کے ساتھ بعض نہایت ولولہ خیز یادیں وابستہ ہیں۔ جنگ میراتھان میں ایرانیوں کی شکست کے بعد ایک یونانی بہادر ایتھنز کی طرف دوڑا اور کسی مقام پر دم لیے بغیر شہر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ وہ بے چارا لڑائی میں گرمجوشی سے حصّہ لینے کے باعث تکان سے چور ہو رہا تھا۔ اس پر بائیس میل کا پہاڑی راستہ دوڑ کر طے کیا۔ آخر طاقت جواب دے گئی۔ اپنے اہل وطن کو صرف یہ پیغام پہنچا سکا کہ "جشن مناؤ، ہمیں فتح حاصل ہوئی" اس کے بعد گرا اور دم توڑ دیا۔

یونانیوں نے اولمپیائی کھیلوں میں اس بہادر یونانی کی دوڑ کو بھی شامل کر لیا۔ چنانچہ جب کھیلوں کا میدان آراستہ ہوتا تو لمبی دَوڑ کا مقابلہ بھی کیا جاتا تھا، جسے "میراتھان" کی دَوڑ کہا کرتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں اولمپیائی کھیل از سر نو شروع ہوئے تو اس دَوڑ کا بھی انتظام کیا گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ پہلی مرتبہ اس دوڑ میں ایک یونانی کسان ہی اوّل نمبر پر رہا۔ اس نے چھبیس میل کی دَوڑ دو گھنٹے پچپن منٹ اور بیس سیکنڈ میں پوری کی۔
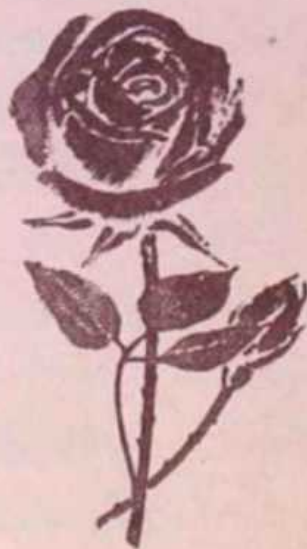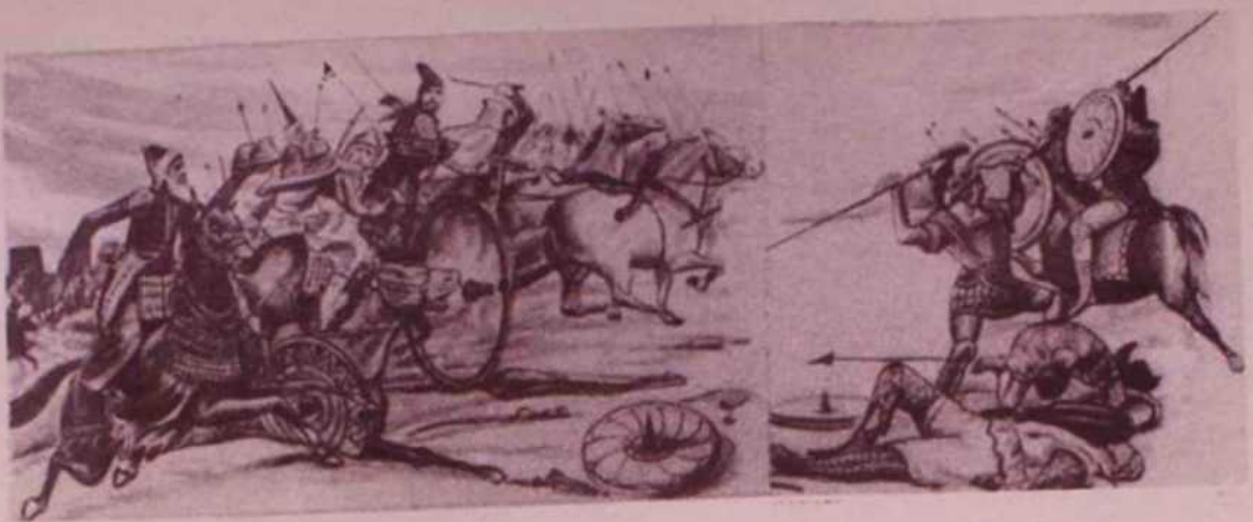
سکندر دُنیا فتح کرنے کے لیے نکلتا ہے

ایرانی ایک مُدت تک تنخواہ دار یونانی سپہ سالاروں کی عقل و دانش اور یُونانی سپاہیوں کی قوتِ بازو سے فائدہ اُٹھاتے رہے۔ اس طرح اُنھوں نے اپنی وسیع سلطنت کے مختلف حصّوں کو فوجی نقطہ نگاہ سے باہم متّحد رکھا، لیکن اربیلہ کے میدانِ جنگ میں پانسا پلٹ گیا۔ یُونانی عقل و دانش کی برتری سکندر کی شکل میں اور یُونانی قوتِ بازو کی برتری مقدونوی سپاہیوں کی شکل میں بروئے کار آئی۔ اب یُونانی یہ مقصد لے کر اُٹھے کہ ایرانی سلطنت کو پاش پاش کر کے دم لیں گے اور وہ اس مقصد میں کامیاب ہُوئے۔

اس جنگ کی کہانی ۳۳۱ ق م کے اس دن سے بہت پہلے شروع ہوتی ہے جب فریقین کی قوتوں کے درمیان آخری فیصلے کے لیے تصادم کی نوبت آئی تھی۔ سکندر کی پرورش ہی اس آرزو کی آغوش میں ہوئی تھی کہ ایرانی قوت کو درہم برہم کیے بغیر چین نہ لے گا۔ سولہ سال کی عمر میں جب اسے پہلے پہل ایک لشکر کا سالار بنایا گیا تو یہ گویا ایرانیوں کو شکست دینے کی راہ میں اس کا اوّلین قدم تھا۔ وہ بیس سال کا تھا کہ اس کے باپ نے وفات پائی اور تاج و تختِ مقدونیہ کے لیے جنگ چھڑ گئی۔ یہ ایرانیوں کو شکست دینے کی راہ میں دُوسرا قدم تھا۔ غرض اس نے سپارٹا کے سوا یُونان کی تمام شہری ریاستوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ۳۳۴ ق م میں تیس چالیس ہزار جنگجوؤں کے ساتھ ہیلس پانٹ کو عبور کر کے ایشیا میں داخل ہو گیا۔

ایرانی بیڑا بحیرۂ ایجیہ میں موجود تھا۔ ایران کے تاجدار دارا کے لیے مناسب یہ تھا کہ پیچھے ہٹ جاتا، تاکہ سکندر کا خطِ رسد پھیل جاتا اور اسے ضروری چیزیں بہم پہنچانے میں مشکلات پیش آتیں، لیکن قدیم زمانے میں بہادری و جوانمردی کا تقاضا یہی سمجھا جاتا تھا کہ اپنی جگہ قائم رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے اور دست بدست لڑائی میں بھی تامّل نہ کیا جائے۔ سکندر کی یہ انتہائی خوش نصیبی سمجھنی چاہیئے کہ ایشیا میں

پہنچتے ہی ایرانی رسالے سے مقابلہ کرنا پڑا اور اس رسالے نے دریائے گرینی کس کے کنارے خوفناک شکست کھائی۔

اس کامیابی کے بعد سکندر نے بحیرۂ روم کا ساحلی علاقہ مسخر کر کے ایرانی بیڑے کو بالکل بیکار کر دیا۔ یہ ہو چکا تو ایرانیوں نے شام کے شمالی علاقے میں اسوس کے مقام پر سکندر سے جنگ کی۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے ایرانی رسالے کی نقل و حرکت میں مشکلات پیش آئیں۔ سوار سکندر کی پیادہ فوج سے عہدہ برآ نہ ہو سکے اور شکست فاش کھائی۔

سکندر نے شکست خوردہ ایرانیوں کا تعاقب نہ کیا بلکہ اپنے تیار کئے ہوئے نقشۂ جنگ کے مطابق پیش قدمی کرتا رہا اور شام، فونیقیہ، فلسطین اور مصر کی بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح پورے ساحل پر تسلط کو مستحکم کر کے ۳۳۱ ق م کے موسم بہار میں اس نے آخری فیصلہ کن لڑائی کے لیے قدم اٹھایا۔ دارا نصف سلطنت دے کر صلح کے لیے تیار تھا، مگر سکندر نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ دراصل وہ بابل کی قدیم سلطنت کے زرخیز مرکزی خطے کا خواہاں تھا جو دو سو سال سے ایرانیوں کے قبضے میں چلا آتا تھا۔ دارا اس خطے کے شمال میں اربیلہ کے قریب ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے سواروں اور پیادوں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے کم نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں یونانی سپاہی صرف سینتالیس ہزار تھے۔

میدان ویسے بھی ہموار تھا، مگر دارا نے اسے اور ہموار کرا لیا، تا کہ ایرانی رسالے اور جنگی رتھوں کو نقل و حرکت میں آسانی رہے۔ سکندر نے صف بندی کرتے وقت اپنے سواروں کو میمنہ پر رکھا۔ جب ایران کے جنگی رتھوں نے یونانی رسالے پر حملہ کیا تو یونانی تیر اندازوں نے تاک تاک کر رتھ چلانے والوں کو اپنے تیروں کا نشانہ بنایا۔ اس طرح جب ایران کے جنگی رتھوں میں افراتفری پھیل گئی تو سکندر کا جو رسالہ اور پیادہ دستے میمنہ پر موجود تھے انھوں نے ترچھے انداز میں میسرے کی طرف پیش قدمی کی اور اس جیش پر پیچھے سے دھاوا بول دیا جو دارا کی حفاظت کر رہا تھا۔ دارا بھاگ نکلا اور ایران کی جس فوج کو شکست دینا غیر ممکن سمجھا جاتا تھا، وہ تباہ ہو گئی۔

فتح ایران کے بعد سکندر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ جہلم کے قریب راجہ پورس کو شکست دی۔ دریائے بیاس سے آگے بڑھنا چاہا تو فوج نے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ سندھ اور بلوچستان کے راستے عراق کے شہر بابل میں جا پہنچا جسے وہ اپنا مرکز حکومت بنانا چاہتا تھا۔ یہیں تینتیس برس کی عمر میں اس نے وفات پائی۔ ساتھ ہی تمام دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ درہم برہم ہو گیا۔ لیکن اربیلہ کے میدان میں اس کی فوج نے یونانی عظمت کا جو نقش قائم کیا تھا، وہ صدیوں تک ایشیا پر اثر انداز رہا۔

قرطاجنہ سرنگوں اور رومہ سربلند ہوتا ہے

جب رُومی لشکروں نے قرطاجنہ کی دیواروں کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا تو اُنھوں نے دُنیا کی پہلی بڑی طاقت پر بربادی کی آخری مہر لگا دی، جس نے زیادہ تر تجارت کے بل پر ہمہ گیر اقتدار حاصل کیا تھا۔ اس افریقی سلطنت کا آغاز کاروبار میں ہنرمندی کی بنا پر ہوا۔ اس کی بے اندازہ دولت و ثروت نے رُومہ کے دل میں رقابت کی آگ بھڑکا دی اور یہی جذبۂ رقابت افریقی سلطنت کی تباہی کا باعث بنا۔

فونیقی ملاحوں نے حضرت مسیح علیہ السلام سے ہزاروں سال پہلے لیبیا کے باشندوں سے تجارتی تعلقات پیدا کر لیے تھے اور ان کا مرکز شمالی افریقہ کے ساحل پر موجودہ ٹیونس کے نزدیک واقع تھا۔ خود قرطاجنہ (کارتھیج) کی بنیاد صور کی ملکہ دیدو نے ۸۵۰ ق م میں رکھی۔ مشہور ہے کہ ملکہ نے بیل کے ایک چمڑے کے برابر زمین خریدی تھی۔ سودا ہو چکا تو چمڑے کے باریک ریشے کاٹ کر بہت بڑا علاقہ گھیر لیا۔ اس میں وہ پہاڑی بھی شامل تھی جس پر قلعہ تعمیر ہوا۔ تیزی سے پھیلتی ہوئی تجارت کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں قرطاجنہ بحیرۂ رُوم کی ملکہ بن گیا۔ اس نئی کاروباری سلطنت نے یونانیوں کی مخالفت کے باوجود سسلی اور ساحل ہسپانیہ پر نوآبادیاں قائم کر لیں، بلکہ اس نے آبنائے جبل الطارق سے آگے بڑھ کر اوقیانوس کے افریقی ساحل پر بھی تجارتی مرکز بنا لیے۔

سسلی ہی کے مقبوضات پر قرطاجنہ کو رُومہ کی اُبھرتی ہوئی قوت سے جنگ پیش آئی (۲۶۸ ق م - ۲۴۱ ق م) جسے تاریخ میں قرطاجنہ کی پہلی جنگ قرار دیا جاتا ہے۔ جزائر ایجہ کی لڑائی میں فیصلہ کن شکست کے باوجود قرطاجنہ کی اقتصادی گرم بازاری برابر قائم رہی۔ اس نے ہسپانیہ کی کانوں سے دھاتیں نکالیں۔ وسطی افریقہ سے اسے حبشی غلام، ہاتھی دانت، مختلف معدنیات اور جواہرات ملتے تھے جنھیں یونان، اٹلی اور سسلی کی منڈیوں میں فروخت کیا جاتا تھا۔ شہر کے اردگرد زرخیز

زمین میں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ اس طرح قرطاجنہ کی آبادی دس لاکھ تک پہنچ گئی اور اس کی اقبال مندی کا پرچم بھی انتہائی بلندیوں پر اُڑنے لگا۔ اس حالت میں دُوسری جنگ پیش آئی (۲۱۸ ق م - ۲۰۱ ق م)

اہل قرطاجنہ کے سامانِ جنگ میں ہاتھیوں کو سب سے نمایاں درجہ حاصل تھا اور ان کا سپہ سالار ہنی بال بھی جنگی ہنرمندی میں بہت باکمال سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ سمندر رومیوں کے زیرِ اقتدار تھا اور خشکی پر ان کی برتری مسلم تھی، بایں ہمہ ہنی بال نے ۲۱۷ ق م میں کوہستان ایلپس کو عبور کر کے شمالی اٹلی پر قبضہ جما لیا اور دس سال تک یہ قبضہ بحال رکھا۔ رُومی مقابلے میں بڑی بڑی فوجیں لائے، لیکن ہنی بال نے انھیں جھیل تھراسی مین، کنائے اور کاپوا میں پے در پے شکستیں دیں۔ اس کا خطِ رسد قابلِ اعتماد نہ تھا لہٰذا وہ مجبور تھا کہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں مقبوضہ علاقے سے حاصل کرے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود وہ رومیوں کی چالوں کو ناکام بناتا اور انھیں نیچا دکھاتا رہا، یہاں تک کہ رومہ کا راستہ صاف ہو گیا۔ اگر ہنی بال کے ہم وطن حکمران اس موقع پر امداد سے ہاتھ نہ کھینچ لیتے تو اغلب تھا کہ وہ رومہ کو فتح کر لیتا۔

اس اثنا میں دو اور مصیبتیں آئیں۔ اوّل جو فوج ہنی بال کی امداد کے لیے آ رہی تھی وہ راستے میں تباہ ہو گئی، دُوسرے ہنی بال کا مدِمقابل فیصلہ کُن کشمکش کو ملتوی کرتا گیا۔ بالآخر ہنی بال کو میدان چھوڑنا پڑا۔ دُوسری جنگ میں ہنی بال نے جو کارنامے انجام دیئے ان کی وجہ سے وہ ممتاز سپہ سالاروں کے اس گروہ میں شامل ہو گیا جنھیں بقائے دوام کا خلعت ملا۔

قرطاجنہ نے ۲۰۱ ق م میں ہتھیار ڈال دیئے۔ رُومہ نے اس کا انتظام ہنی بال کے ہاتھ میں رہنے دیا اور وہ خفیہ خفیہ قرطاجنہ کی پہلی عظمت بحال کرنے میں لگا رہا۔ جب رُومیوں کو اس کے ارادوں کا علم ہو گیا تو ہنی بال شہر چھوڑ کر بھاگ نکلا اور انجام کار خودکشی کر لی۔ ۱۴۹ ق م میں رومی لشکر بہانہ پیدا کر کے قرطاجنہ پر جا چڑھے۔ شہر کی آبادی پانچ لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ اس میں سے صرف پچاس ہزار زندہ بچے جنھیں غلام بنا کر بیچا گیا۔ شہر کو آگ لگا دی گئی اور اس کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا۔

Capua -۳ Cannae -۲ Thrasimene -۱

سیزر کو موت کے گھاٹ اُتارا جاتا ہے

۱۵ مارچ ۴۴ ق م کو روما کے ایوانِ اعلیٰ میں جولیئس سیزر جمہوریت پسندوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ قاتلوں میں سیزر کا دوست بروٹس بھی شامل تھا۔ سیزر نے آخری سانس کے ساتھ اُسے یُوں سرزنش کی تھی: "بروٹس تو بھی؟" شکسپیئر کے قلم نے اس منظر کو بقائے دوام کا لباس پہنا دیا ہے۔ دراصل یہ منظر ماضی کی تاریکی میں ایک ممتاز نشان ہے اور یہ اس کشمکش کی ایک ڈرامائی تمثیل ہے، جو دُنیا میں اب تک جاری ہے۔ رومہ کی تاریخ میں اس کا آخری فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔

سیزر کے خلاف قتل کی سازش کرنے والے لوگ رومہ کے جمہوری نصب العین پر کامل یقین کے ساتھ ڈٹے ہوئے تھے اور اس امر کے ہرگز روادار نہ تھے کہ تمام اختیارات سمٹ کر سیزر کی ذات میں جمع ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیزر کے قتل کو عزت و احترام کا وہ پائدار درجہ حاصل ہوگیا، جو عام سیاسی جرائم کو نصیب نہیں ہوتا۔ سازشیوں کو یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ سیزر محض شہنشاہ ہی نہیں بلکہ دیوتا اور رب النوع بھی بن جانا چاہتا ہے اور یہ خطرہ خالی از حقیقت نہ تھا، لیکن رومہ شاہنشاہی کے راستے پر لگ چُکا تھا۔ چنانچہ سیزر کی موت بھی اس کا رُخ نہ پلٹ سکی۔ آگسٹس اور بعد کے رومی شاہنشاہ اس انداز میں تاج و تخت کے مالک بنتے رہے، گویا سیزر قتل نہ ہوا تھا، بلکہ بدستور زندہ تھا۔

سپہ سالار کی حیثیت سے جولیئس سیزر کی شہرت تاریخ عسکریت کے اوراق پر ثبت ہو چکی تھی۔ اس شہرت کا ایک سبب وہ تحریریں تھیں، جن میں اس نے گال کی مہمات تفصیل سے بیان کیں۔ یہ تحریریں حُسنِ بیان کا ایسا نمونہ پیش کر رہی ہیں جس سے بہتر نمونہ اب تک دُنیا کے سامنے نہیں آسکا۔ سیزر نے وحشی جرمن قبیلوں کو مسخر کیا، ہسپانیہ اور ایشیا میں اپنی

مہارت فنِ حرب کی بے مثال نمائش کی۔ پھر وہ برطانیہ پر حملہ آور ہُوا۔ اس کی مطلق العنانی (ڈکٹیٹرشپ) کا دور چار سال تک جاری رہا۔ رومہ سالہا سال سے سیاسی کشمکشوں کی جولانگاہ بنا ہُوا تھا۔ سیزر نے اسے نظم و امن کی دولت بخشی۔ بیشتر صوبوں کے حکمران اپنے سوا کسی کے رُوبرُو جواب دہ نہ تھے۔ سیزر نے صوبائی حکومتوں کا نظام درست کر کے رومہ کو تمام اختیارات کا مرکز بنایا۔ اس نے کاروبار اور زراعت کی ترقی کے لیے مفید اقتصادی تدبیریں اختیار کیں۔ سیاسیات میں وہ "حزبِ عوام" سے وابستہ تھا۔

قُدرت نے اسے نظم و نسق کی غیر معمولی صلاحیت عطا کی تھی۔ یقیناً اس کا عزم یہی تھا کہ دنیا کا زیادہ سے زیادہ حِصّہ فتح کرے اور اس پر بہتر سے بہتر انداز میں حکم چلائے، لیکن جمہوری اداروں سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

قتل کی سازش کرنے والے لوگ سیزر کی جنگی یا انتظامی قابلیت کے منکر نہ تھے، ان خدمات کے منکر نہ تھے جو سیزر نے اپنے دورِ اقتدار میں انجام دی تھیں اور ان کے اعلیٰ نتیجے ہر طرف سب کو نظر آ رہے تھے۔ انھیں یہ بھی خیال تھا کہ سیزر کو مزید مہلت مل گئی تو اس سے ملک اور قوم کو بڑا فائدہ پہنچے گا، لیکن جمہوری حقوق ان کی نگاہوں میں تمام مذکورہ بالا چیزوں سے زیادہ قیمتی تھے۔ انھیں یہ خطرہ پریشان کر رہا تھا کہ اگر آج یہ حقوق سیزر کی وجہ سے پامال ہو گئے تو پھر ان کے بحال ہونے کی کوئی صُورت باقی نہ رہے گی۔ سیزر یقیناً بڑا قابل جرنیل اور بہت اعلیٰ درجے کا منتظم تھا، لیکن ضروری نہ تھا کہ جانشین جنگی اور انتظامی قابلیت میں اسی پائے کے ہوتے۔ تاہم جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، سیزر کے قتل سے جمہوری حقوق محفوظ نہ ہو سکے۔ شاہنشاہی اور مطلق العنانی کی مصیبت رُک نہ سکی، بلکہ زیادہ تیزی سے آئی اور ایسے لوگ بھی تخت کے مالک بنے جو بادشاہ ہونے کی حیثیت میں نہیں، بلکہ انسان ہونے کی حیثیت میں بھی بدترین تھے۔
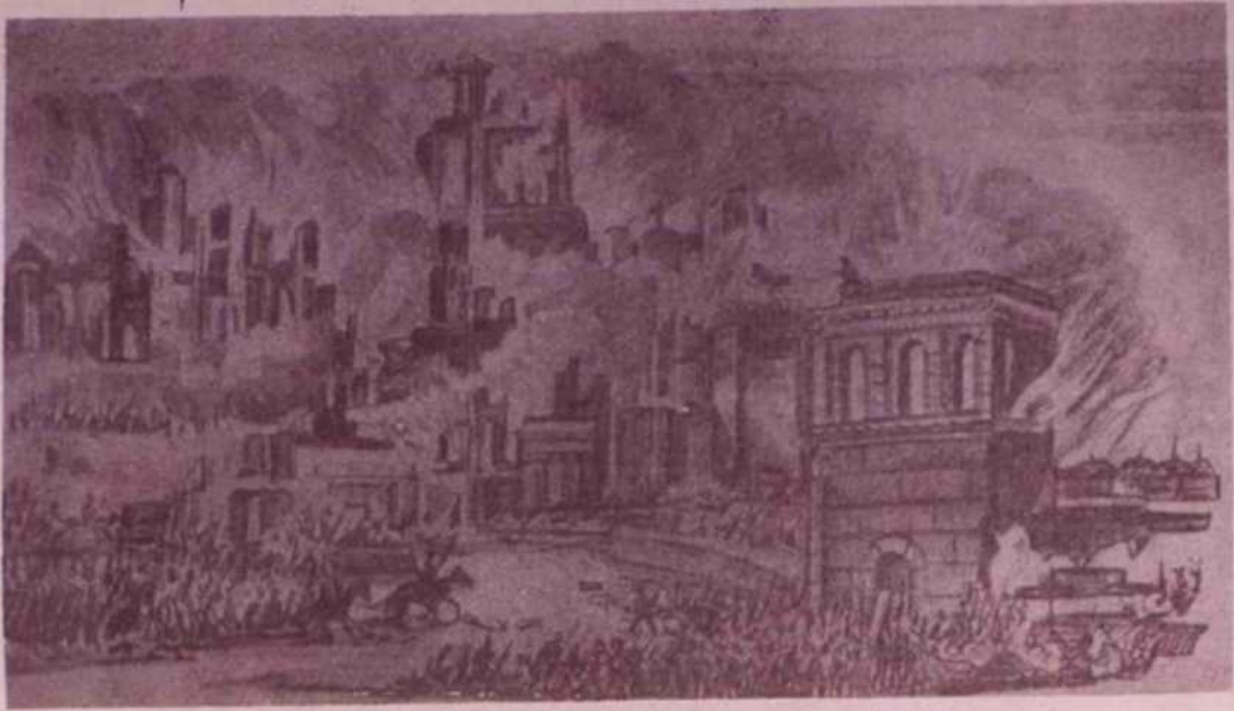
یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجتی ہے

آخرکار ۱۳۵ء میں شاہنشاہ ہیڈرین کا رومی لشکر یروشلم کو برباد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس سے پیشتر بہت سے دشمنوں نے ایسی کوششیں کیں، مگر انھیں پوری کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ شہر کاملاً تباہ و برباد کر دیا گیا۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی عمارت بھی سلامت نہ رہی اور یہودیوں کے نام حکم جاری ہوگیا کہ وہ آیندہ کبھی اس شہر میں واپس نہ آئیں۔

یروشلم کی تاریخ پتھر کے دور سے شروع ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی دوسرا شہر پیش نہیں کیا جا سکتا جس کی سرگزشت اس درجہ ہنگامہ خیز اور دردناک ہو۔ ہمارے سامنے تینتیس صدیوں کا تاریخی سرمایہ موجود ہے اس اثنا میں یہ شہر بارہ زلزلوں کا نشانہ بھی بنا جنھیں قدرت کے تھپیڑے قرار دینا چاہیئے۔ ان کے علاوہ کم و بیش بیس مرتبہ اسے ناکہ بندیوں اور محاصروں سے سابقہ پڑا۔ دو مرتبہ ایسی بری طرح اس کی اینٹ سے اینٹ بجی کہ لمبی مدت تک کے لیے حالات کا کوئی سراغ ہی نہیں ملتا۔ اٹھارہ مرتبہ اسے تقریباً نئے سرے سے تعمیر کرنا پڑا۔ چھ مرتبہ اس کے باشندوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا۔

اس کی ڈرامائی تباہی کا پہلا واقعہ ۷۰ء میں پیش آیا۔ ۴ ق م میں ہیرودیس اعظم مرا۔ اس کے بعد مختصر وقفوں کو چھوڑ کر یہودیہ پر رومی گماشتے ہی حکومت کرتے رہے۔ نظم قائم رکھنے میں ان کی مشکلات بڑھتی گئیں۔ دیہاتی علاقے کا چپہ چپہ ڈاکوؤں سے معمور تھا۔ مذہبی اختلافات کی بنا پر قتل و خونریزی کا سلسلہ روز افزوں تھا۔ جب یہودیوں نے رومی سپاہیوں کے ایک دستے کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو رومی شاہنشاہ نیرو کو سخت تادیبی کارروائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وسپیشن[1] اور ٹائیٹس[2] رومی لشکر لے کر آئے اور ملک میں سیل کی طرح پھیل گئے۔ تین

۱- Vespasian ۲- Titus

سال کی کشمکش کے بعد یروشلم کو نہایت ہولناک حالات میں تباہ کر دیا گیا۔ مقدس ہیکل کو بھی آگ لگا دی گئی۔ یہ یہودیوں کی سلطنت کے خاتمے کا رسمی اعلان تھا۔

یروشلم کا محاصرہ جاری تھا۔ جب یوحنان بن زکائی نام ایک یہودی نے رومی جرنیل سے اجازت لے کر یبنہ[1] میں ایک ربی درسگاہ قائم کی۔ اسے یقین تھا کہ بے شک مقدس ہیکل آگ کی نذر ہو جائے، لیکن جب تک یہودیت کی تعلیم کا سلسلہ باقی ہے، اسے کوئی قوت مٹا نہیں سکتی اور تورات بدستور یہودیوں کا وطن بنی رہے گی، خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں منتقل ہو جائیں۔

جو یہودی گروہ، یہودیہ مصر یا طرابلس میں لڑ رہے تھے، ان کی بیخ کنی کر دی گئی۔ فلسطینی یہودیوں کی تقدیر پر آخری مہر اس وقت لگی جب شاہنشاہ ہیڈرین نے ۱۳۲ء میں یہودیت کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ برکوکبا کو مسیح قرار دے کر یہودیوں نے تین سال بہادرانہ جنگ جاری رکھی، لیکن ان کے لیے کامیابی کی کوئی امید نہ تھی۔ یروشلم ۱۳۵ء میں مسخر ہوا تو حکم دے دیا گیا کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ جس جگہ شہر آباد تھا، وہاں کھیتی باڑی شروع کر دی گئی۔ اس وقت سے بیسویں صدی تک یہودی روئے زمین پر آوارہ وطن ہو کر ٹھوکریں کھاتے رہے۔

یروشلم کی عظمت اور شان کا پہلا دور وہ تھا جب یہ شہر حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کا مرکز تھا۔ اس دور کی ہر قابل ذکر عمارت بخت نصر شاہ بابل نے تباہ کر ڈالی، یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا بنایا ہوا مقدس ہیکل بھی باقی نہ چھوڑا۔ اس کی مغربی دیوار کے پتھر عام روایت کے مطابق ملبے کے نیچے باقی رہ گئے تھے، جن سے لپٹ کر رونا یہودیوں کے نزدیک ایک خاص عبادت بن گیا تھا۔ سائرس شہنشاہ ایران نے شہر اور ہیکل کو از سر نو تعمیر کرنے کا حکم دیا اور یہ دوبارہ ۷۰ء میں تباہ ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ تعمیر ہوا تو شاہنشاہ ہیڈرین نے حکم دے دیا کہ یہودیوں کو نکال دیا جائے اور شہر کو رومیوں کا ایک مرکز بنا دیا۔ رومی شاہنشاہ نے مسیحیت قبول کر لی تو یہودیوں پر اس وقت بھی پابندیاں باقی رہیں، بلکہ ان پر سختیاں ہوتی تھیں۔ جب فلسطین کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ آئی تو ہیکل کی جگہ مسجد تعمیر ہوئی۔ یہی زمانہ ہے جس میں یہودیوں اور عیسائیوں کو زیارتوں کی عام اجازت تھی۔

امن اور خیر سگالی کی اس فضا میں خلل اس وقت پیدا ہوا جب یورپ نے صلیبی جنگیں شروع کیں۔ اس دور کے خاتمے پر صدیاں گزر گئیں تو پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کا دروازہ کھول دیا۔ اس وقت سے جو فتنہ پیدا ہوا اس کی وجہ سے پورے مشرق قریب کا امن خطرے میں پڑا ہوا ہے۔

۱۔ اس مقام کو حضرت یوشع کی کتاب میں "یبنی ایل" کہا گیا ہے یعنی خدا کا بنایا ہوا۔ یہ یافا سے گیارہ میل جنوب میں تھا۔ رومیوں کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی کے زمانے میں یبنہ یا یبنی ایل یہودیہ کا سب سے بڑا شہر بن گیا تھا۔

مشرق میں نئے رومہ کی بُنیاد پڑتی ہے

رومی سلطنت کا مرکز ابتدا سے رومہ چلا آتا تھا۔ ۱۱ مئی ۳۳۰ء کو برّاعظم یورپ کے جنوبی و مشرقی کونے میں ایک نیا مرکز قائم ہوا جس نے قسطنطنیہ کے نام سے شہرت پائی اور ایک ہزار سال تک اسے دُنیا کا اوّلین شہر ہونے کا فخر حاصل رہا۔ اس کا سرکاری نام "نیا رومہ" رکھا گیا تھا قسطنطنیہ اس کا دُوسرا نام ہے۔

مرکز کی اس تبدیلی کے کئی اسباب تھے۔ مثلاً:

۱۔ اس کا محلِ وقوع بہت اچھا تھا۔

۲۔ شاہ قسطنطین نے مسیحی کلیسا سے اتحاد کا جو رشتہ جوڑا تھا اُسے استوار رکھنے کے لیے نئی فضا ہی ساز گار تھی۔

۳۔ اگرچہ یورپی بربریوں کے اندر بھی بے چینی کی لہریں دَوڑ رہی تھیں، لیکن رُومی سلطنت کو اصل خطرہ ایران کی طرف سے تھا، جو مشرق کی طرف واحد عظیم الشّان مہذّب سلطنت تھی اور رومی شاہنشاہوں کو آئے دن اس سے مقابلے پیش آتے رہتے تھے۔

۴۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ سلطنت کی سب سے بڑی دولت اور سب سے بڑی آبادی مشرق ہی میں تھی۔

۵۔ ۳۳۰ء تک سلطنت میں پھیلاؤ کی کوئی صورت نہ رہی تھی اور اصل کام یہ رہ گیا تھا کہ جو علاقے قبضے میں تھے، ان کی حفاظت کا انتظام کر لیا جاتا۔

۶۔ مرکز کی حیثیت میں رومہ کی اہمیت بہت پہلے سے رُو بہ زوال تھی۔ اس لیے ایوانِ اعلیٰ یا عوام کو کوئی اختیار حاصل نہ رہا تھا۔

قسطنطین سے پیشتر شہنشاہ ڈائیوکلیشین[۱] نے بھی انتظام کی درستی کے خیال سے سلطنت کو دو

۱۔ Diocletian

حصوں میں تقسیم کرنا چاہا تھا۔ قسطنطین نے تقسیم کے ساتھ ہی مسیحیت کو سرکاری مذہب بنا دیا۔

آبنائے باسفورس کے جنوبی گوشے میں جہاں قسطنطنیہ آباد ہؤا، ایک ہزار سال، بلکہ اس سے بھی پیشتر بیزنطیم آباد تھا اور یہ جگہ جنگی نقطۂ نگاہ سے اتنی اہم تھی کہ یُونان کی شہری ریاستیں اسے قبضے میں لانے کے لیے مدّت تک لڑتی رہیں۔ بلاشبہ اس کا موقع اور محل نہایت اہم تھا۔ اس کے جنوب میں بحیرۂ مارمورا اور شمال میں باسفورس کی ایک شاخ چار میل اندر چلی گئی تھی، جسے اب شاخِ زریں کہتے ہیں۔ بحیرۂ اسود سے بحیرۂ رُوم تک جابجا تنگنائیں تھیں جن سے دشمن کے لیے سلامت گزرنا بہت مشکل تھا۔ رومہ کی طرح اس جگہ بھی سات پہاڑیاں تھیں، جن پر شہر آباد ہؤا۔ پہاڑیوں اور سمندر نے مل کر شہر کی طبعی حفاظت کے ایسے انتظامات کر دیئے تھے، جنھیں توڑنا آسان نہ تھا۔

مغربی رومی سلطنت آہستہ آہستہ بربریوں کے قبضے میں جاتی رہی اور مشرقی رومی سلطنت کے مرکز کی اہمیت بڑھتی گئی۔ ۴۷۶ء میں مغربی سلطنت بالکل ختم ہوگئی۔ اس کے بعد قسطنطنیہ ہی یونانی و رومی تہذیب کی روایات کا حامل رہ گیا۔ اس نے بربریوں اور ایرانیوں کے حملے ناکام بنائے، پرانے فنون کی سرپرستی کی، تجارت کو ترقی دی اور مسیحیت کی اس شاخ کے لیے نشوونما کا سامان بہم پہنچایا جو آرتھوڈکس مشرقی مسیحیت کہلاتی ہے۔

حکومت کے دونوں مرکزوں کے درمیان سیاسی اختلافات کی طرح مذہبی اختلافات بھی بڑھتے گئے۔ آخر مسیحیت دو بڑی شاخوں میں بٹ گئی۔ ایک مشرقی شاخ، دُوسری مغربی شاخ۔ گیارھویں صدی کے وسط تک قسطنطنیہ بڑی بڑی ایشائی قوتوں کے مقابلے میں یورپ کا پشتیبان بنا رہا۔ تجارت میں اسے سب پر برتری حاصل تھی۔ اس کے اثر و رسُوخ کا اصل راز یہ تھا کہ وہ ایک پُرانی میراث کا محافظ تھا۔ اس میں رومی قانون نہ محض محفوظ رہا، بلکہ جسٹینین کے ضوابط نے اس قانون کو تکمیل کی آخری منزل پر پہنچا دیا۔ یہیں سے یُونانی علوم مغربی یورپ میں پہنچے اور احیائے علوم کی روشنی کے لیے ابتدائی سروسامان فراہم ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی رُومی سلطنت میں یونانیت زیادہ سے زیادہ فروغ پاتی رہی اور جسٹینین کے بعد یونانی یہاں کی سرکاری زبان بن گئی۔

قسطنطنیہ ساتویں صدی سے پندرھویں صدی کے وسط تک مختلف یُورشوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح عثمانی نے اسے فتح کرلیا اور اس کا نام استنبول رکھا۔ آج کل اسے اسی نام سے پُکارا جاتا ہے۔

رومہ بربریوں کے قبضے میں جاتا ہے

رومہ نہ ایک دن میں تعمیر ہوا تھا اور نہ ایک دن میں فنا کے گھاٹ اُترا، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یورپ سے رومی شاہنشاہی کا ناپید ہونا بہت بڑا واقعہ تھا، اتنا بڑا کہ رومہ کی فتح کا ذکر سُنتے ہی چشم تصوّر کے سامنے ایک نہایت خوفناک نقشہ اُبھر آتا ہے اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ بے درد بربری اس شہر کی دولت و حشمت کے انبار سمیٹ کر لے گئے اور اسے آگ اور خون کی جولانگاہ بنا کر چھوڑ گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ رومہ کی عظمت آہستہ آہستہ زائل ہوتی رہی۔ مؤرخوں نے سہولت کے خیال سے اس کی تسخیر کا آخری سال ۴۷۶ء قرار دے دیا ہے۔ اسی سال مغربی رومی سلطنت کے شاہنشاہ نے اپنا تاج و تخت بربری سردار اوڈوآسر[۱] کے حوالے کیا۔ اوڈوآسر نے اپنے لیے شاہنشاہ نہیں، بلکہ فرمانروائے اٹلی کا لقب پسند کیا۔

یہ خیال بھی نہ ہونا چاہیئے کہ بربری قبیلے کسی بیرونی سردار کے زیرِ قیادت اچانک رومہ پر چڑھ آئے تھے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رومی سلطنت کے پہلے شاہنشاہ آگسٹس کے زمانے میں بربریوں کو اٹلی میں آباد ہونے کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ سلطنت کے لیے جنگجو سپاہی بھی مہیا کرتے رہے اور اُونچے درجے کے سرکاری عہدوں پر بھی قابض رہے۔ اوڈوآسر نے بربریوں سے اٹلی کے ایک تہائی علاقے کا وعدہ کر کے سرداری کا منصب حاصل کر لیا۔ رومی شاہنشاہ کو جب یقین ہو گیا کہ وہ بربریوں کے مقابلے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تو عافیت اسی میں سمجھی کہ تخت چھوڑ کر الگ ہو جائے۔ قسطنطنیہ کے شاہنشاہ زینو[۲] نے اوڈوآسر کی حکومت تو تسلیم نہ کی، تاہم اسے معزول کرنے کے لیے بھی کوئی قدم نہ اُٹھایا اور اس کے لیے وہی خطاب استعمال کرتا رہا جو مغربی رومی سلطنت میں خاندانی امیروں کا عام خطاب تھا۔

مشرقی گاتھوں کے سردار تھیوڈرک[۳] نے اوڈوآسر کو میدانِ جنگ میں شکست فاش دی اور صلح اس شرط پر ہوئی کہ دونوں مشترکہ طور پر حکومت کا کاروبار جاری رکھیں۔ پھر تھیوڈرک نے اوڈوآسر کو دعوت میں بُلا کر اپنے ہاتھ سے اس کا سر قلم کر دیا۔

مغربی رومی سلطنت کے خاتمے سے یورپ کو موقع مل گیا کہ اپنی مخصوص تہذیب کو نشو و نما دے سکے۔

۱- Odoacer ۲- Zeno ۳- Theodoric

شارلمین رومی سلطنت کا تاج پہنتا ہے

بعض مؤرخوں کا خیال ہے کہ شارلمین[1] چارلس اعظم، مغربی رومی سلطنت کا تاج پہننے کا نہ خواہاں تھا اور نہ اس تاج پوشی پر خوش ہوا۔ شاہ فرانس کی حیثیت میں اس نے ایک وسیع اور پائدار سلطنت کی بنیادیں استوار کر لی تھیں۔ رومی شاہنشاہی نے اس کی قوت میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہ کیا، بلکہ نظری اعتبار سے دیکھا جائے تو اس نے زوال پذیر شاہنشاہی نظام کے اندر بہ حیثیت مجموعی مشرقی شاہنشاہ کے مقابلے میں کمتر حیثیت قبول کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہنشاہی کا لقب کارکنانِ سلطنت کے بجائے کلیسا کے لیے زیادہ اہم تھا۔

بہر حال شارلمین ۸۰۰ء میں رومہ پہنچا۔ بظاہر اس کی غرض یہ تھی کہ پوپ لیو[2] سوم کے طرزِ عمل کی چھان بین کے لیے بشپوں کا جو کمیشن مقرر ہوا تھا، اس کے کام کا جائزہ لے۔ شارلمین تین ہفتے رومہ میں ٹھہرا۔ کمیشن نے لیو کو تمام الزامات سے بری قرار دیا اور شارلمین نے اس فیصلے کی تصدیق کر دی۔ دو روز بعد تاج شاہی اس کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔

اس کے بعد مشرقی سلطنت کے سلسلے شرطیں طے کرنے کا مسئلہ چھڑ گیا۔ شارلمین نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ مشرقی سلطنت کی ملکہ آئرین[3] سے شادی کر کے دونوں سلطنتوں کو متحد کر دے۔ اس اثنا میں ملکہ آئرین کو تخت سے اُتار دیا گیا اور نسی فورس[4] مشرقی سلطنت کا شاہنشاہ بن گیا۔ اب دونوں سلطنتوں کی سرحدوں کے بارے میں لڑائی چھڑ گئی۔ ایڈریاٹک میں ایک بحری جنگ بھی پیش آئی۔ آخر شارلمین کو جھکنا پڑا اور ۸۱۲ء میں دونوں سلطنتوں کی مساوی تقسیم عمل میں آ گئی۔

اطالوی قبیلوں میں سے لمبارڈ[5] پاپائیت کے سب سے بڑے دشمن تھے اور وہ مشرقی شاہنشاہی کے زیرِ اثر کام کر رہے تھے۔ شارلمین شاہنشاہ بننے سے پچیس برس پہلے لمبارڈوں کی قوت کو توڑ چکا تھا۔ یورپ کا مالک بن جانے کے بعد اس نے آخن کو دارالحکومت بنایا۔

۱- Charlemagne ۲- Leo III ۳- Irene ۴- Nicephorus ۵- Lombards

انگریز نارمنوں سے شکست کھاتے ہیں

اگرچہ لڑائی صرف دوپہر سے رات ہونے تک جاری رہی، تاہم یہ سخت خونریز، فیصلہ کن اور نتائج کے اعتبار سے بڑی اہم تھی۔ کوئی انگریز یا امریکی طالب علم نہ تاریخ فراموش کرسکتا ہے ——— ۱۰۶۶ء ——— اور نہ میدانِ جنگ ——— ہیسٹنگز۔

انگلستان کا متقی بادشاہ ایڈورڈ ۱۰۵۱ء میں فرانس گیا تو غالباً اس نے نارمنڈی کے ڈیوک ولیم سے تاج و تخت انگلستان کا وعدہ کرلیا تھا۔ ۱۰۶۴ء میں ویکس کے امیر ہیرلڈ کا جہاز ساحل فرانس کے قریب تباہ ہوگیا اور اسے نارمنڈی میں اترنا پڑا۔ ولیم نے اسے قید کرلیا اور تاج کا وعدہ لیے بغیر رہا نہ کیا۔ جب ۱۰۶۶ء میں ہیرلڈ خود انگلستان کا بادشاہ بن گیا تو ولیم ۲۸ ستمبر ۱۰۶۶ء کو فوج کے ساتھ ساحل انگلستان پر لنگر انداز ہوا، تاکہ جو وعدے توڑے گئے ہیں، انھیں بزورِ شمشیر پورا کرائے۔

ہیرلڈ نے جلدی میں سپاہی فراہم کیے اور حملہ آور کے مقابلے کے لیے اس پہاڑی پر پہنچ گیا جو قصبہ ہیسٹنگز سے تقریباً چھ میل ہے۔ اس کے آدمی زیادہ تر پیادہ تھے۔ اگرچہ تعداد میں وہ ولیم کے آدمیوں سے یقیناً زیادہ تھے لیکن ان میں اکثر کے پاس نہ تو اچھے ہتھیار تھے اور نہ نارمنوں کے برابر جنگی تجربہ تھا۔

ایک دُوسرے کے بالمقابل صف بندی ہوچکی تو پہلے ولیم کے تیر اندازوں نے تیروں کا مینہ برسایا۔ پھر اس کی پیادہ فوج نے حملہ کیا۔ ہیرلڈ کے سپاہی ڈھالیں جوڑ کر ایک مضبوط دیوار کی شکل میں جم گئے۔ وہ لمبے دستے والے تبر اس چابک دستی سے چلاتے تھے کہ ولیم کے مسلح سوار بھی ان پر غلبہ نہ پاسکے۔

اب ولیم نے ایک عجیب چال چلی۔ اس نے اپنی سپاہ کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ جونہی وہ پیچھے ہٹی، ہیرلڈ کی فوج اس کے تعاقب میں آگے بڑھی اور اس طرح وہ مضبوط دیوار ٹوٹ گئی جسے ولیم کی جنگی قوت نہ توڑ سکی تھی۔ عین اس وقت ولیم کے سواروں نے پلٹ کر شدید حملہ کیا اور ہیرلڈ کی سپاہ کو سخت نقصان پہنچایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ولیم دوبارہ اسی چال پر کاربند ہوا۔ ہیرلڈ کی محافظ فوج آخری دم تک مقابلے پر جمی رہی، لیکن ولیم کے تیر اندازوں نے اس کے پرخچے اڑا دیے۔ اس طرح نارمن انگلستان پر قابض ہوگئے۔ رومیوں اور ڈینوں سے کہیں زیادہ اثر نارمنوں کی فتوحات سے پڑا۔

برطانیہ میں آزادی کے منشور پر دستخط ہوتے ہیں

۱۲۱۵ء اس وجہ سے ہمیشہ یاد رہنے والا تاریخی سال بن گیا کہ اس سال انگلستان کے بادشاہ جان[1] نے اس فرمان پر دستخط کیے جو منشورِ اعظم[2] کے نام سے مشہور ہے۔ یہ منشور امریکہ اور برطانیہ کی شہری آزادی کا بنیادی پتھر بن گیا۔

جان عالی ظرف بادشاہ نہ تھا کہ سمجھ لیا جائے وہ کسی قیمتی حق کو خوش دلی سے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو گیا ہو گا۔ اس نے باپ کے خلاف باغیانہ سازش کی اور تعلقات بگاڑ لیے۔ امیروں اور عوام کو بھی عجیب و غریب منصوبوں سے پریشانی میں مبتلا کرتا رہا۔ بھاری ٹیکس لگائے۔ صلیبی لڑائیوں اور جنگ فرانس کا خرچ عوام کے ذمے ڈال دیا۔ عدالتی نظام بگڑ گیا۔ کلیسا کو بھی شکایتیں پیدا ہوئیں اور جان کی نجی زندگی بھی رسوائی کے دھبوں سے آلودہ تھی۔

آخر امیروں نے تنگ آ کر اس کے سامنے نپے تلے مطالبے پیش کر دیئے۔ ساتھ ہی دھمکی دی کہ اگر ان کے مطالبات مانے نہ گئے تو بغاوت ہو جائے گی۔ جان نے کھلی شکست سے بچنے کے لیے کلیسا کو کچھ رعایتیں دے دیں۔ ان کے لیے آزاد انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا اور باشندگانِ لندن کے لیے خاص حقوق کا انتظام کر دیا گیا۔ تاہم امیر جو مطالبات پیش کر چکے تھے ان پر مضبوطی سے جمے رہے۔ آخر ۱۵ جون ۱۲۱۵ء کو خفیف ردّوبدل کے بعد منشورِ اعظم پر دستخط ہو گئے۔ بعد ازاں تمام بادشاہ اس کی تصدیق کرتے رہے۔

یہ بھی جان لینا چاہیے کہ منشورِ اعظم میں صرف بادشاہ اور کلیسا، نیز بادشاہ اور اُمراء کے درمیان تعلقات کی حیثیت واضح کی گئی تھی، لیکن ان میں سے کسی کو عوام کی بہتری اور بہبود سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جو لوگ آزاد تھے انھیں یہ حق مل گیا کہ اپنے مقدمات کا فیصلہ حلقے کے امیروں سے کرا لیں۔ انگلستان کے زیادہ تر باشندے زرعی غلام تھے۔ انھیں مزید چار سو سال اسی حالت میں گزارنے پڑے۔ بایں ہمہ منشورِ اعظم کو ایک اہم سنگِ میل سمجھا جاتا ہے اور اسے حقیقی جمہوریت کے راستے میں بڑی اہم حیثیت حاصل ہے۔

---

[1] John [2] Magna Carta

بارُود ایجاد ہوتی ہے

قصے کہانیوں میں بتایا جاتا ہے کہ سب سے پہلے چنگیز خاں نے جنگ میں بارود سے کام لیا۔ یہ بات صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ چنگیز خاں کے زمانے سے بہت پہلے، یعنی نویں صدی میں اہل چین بارود بناتے اور اسے آتشیں پٹاخوں میں استعمال کرتے تھے۔ یورپ میں بارود کی ایجاد کا سہرا دو راہبوں میں سے کسی ایک کے سر پر باندھا جاتا ہے: ایک انگریز راجر بیکن[1] دوسرا، جرمن برتھولڈ شوارٹز[2]۔ بارود ہی کے بل پر یورپی سپاہیوں نے روئے زمین پر حکمرانی کے جال بچھائے۔

بارُود کے لیے تین چیزیں درکار تھیں: اول قلمی شورہ، دوم گندھک، سوم کوئلہ۔ بیکن نے شورے کو صاف کر کے قلمی شورہ بنانے کا طریقہ دریافت کیا اور بارود کا نسخہ تیار کر دیا۔ شوارٹز نے اس سے کام لینے کے لیے آتش بار ہتھیار تیار کر دیئے۔

بہرحال بارود سازی کا بندوبست ہو گیا تو یورپ کی فوجیں تلوار، نیزے اور تیروں کی جگہ لڑائی میں گولیاں استعمال کرنے لگیں۔ بینک برن[3] کی لڑائی میں رابرٹ بروس نے انگریزوں کو مغلوب کر لیا (۱۳۱۴ء) کریسی[4] میں انگریزوں نے فرانسیسی امیروں کو تباہ کر ڈالا (۱۳۴۶ء) ان دونوں لڑائیوں میں بارود استعمال ہوئی۔ تاہم اس کی اہمیت کا پورا اندازہ نہ ہو سکا۔ تجربات جاری رہے۔ یہاں تک کہ پندرھویں صدی میں بندوق ایجاد ہوئی اور مدِمقابل کو دُور سے موت کے گھاٹ اُتارا جانے لگا۔

حقیقت یہ ہے کہ بارُود کی ایجاد کے بعد صدیوں تک یہ مسئلہ پریشانی کا باعث بنا رہا کہ اس سے کام لینے کے لیے موزوں ہتھیار کونسا ہو سکتا ہے۔ پہلے توڑے والی بندوق ایجاد ہوئی، پھر چقماقی بندوق نکلی۔ ۱۸۰۷ء میں انگریز اندر جان فارسٹھ[5] نے ایک ایسی بندوق تیار کی جس کے پیالے پر تانبے کی ٹوپی رکھی جاتی تھی۔ تیس سال تک غور و فکر کے بعد فوجی ماہروں نے اسے استعمال کرنا منظور کر لیا۔ آتش بار ہتھیاروں میں اصلاحات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان میں غیر معمولی ترقی پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ہوئی۔ چھوٹے سے چھوٹا ہتھیار ۲۲ نمبر کا پستول تھا اور بڑے سے بڑا ہتھیار جرمنوں کی توپ جسے بگ برتھا[6] کہتے تھے۔ اس کی مار اسی میل تک تھی۔

بارُود سُرنگیں بنانے اور چٹانیں توڑنے میں بھی استعمال ہوتی ہے۔

۱- Roger Bacon ۲- Berthold Schwartz ۳- Bannockburn یہ سکاٹ لینڈ میں ہے۔
۴- فرانس میں Crecy ۵- John Forsyth ۶- Big Bertha

قطب نُما سات سمندر مسخّر کرتا ہے

نقل و حرکت کے بہت سے پُرانے سامان مثلاً بیل گاڑی، گھوڑا، بادبان اور چپو وغیرہ فرسودہ ہوگئے، لیکن برقی آلات کی ایجاد کے باوجود قدیم قطب نما بدستور کارآمد چلا آرہا ہے۔ جہاں راہ و منزل کا کوئی نشان نہیں ملتا، وہاں مسافروں کا سب سے بڑا سہارا قطب نما ہی ہوتا ہے۔ یقیناً اس میں بھی اصلاحات ہوئیں لیکن ان کی رفتار بہت سُست تھی۔ اصل مقناطیسی آلہ آج بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ چودھویں صدی میں یا اس سے پیشتر تھا۔ سیر و گردش میں انسان اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

کوئی نہیں جانتا کہ یہ سادہ سا آلہ کس نے بنایا اور کس نے سب سے پہلے اسے استعمال کیا۔ قیاس یہ ہے کہ بحیرۂ روم کے کسی ملّاح کے پاس یہ آلہ موجود ہوگا۔ یکایک موسم خراب ہوگیا۔ آسمان پہ بادل چھا گئے۔ ستاروں کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھانے کی کوئی صُورت باقی نہ رہی۔ اس موقع پر آلے نے کام دیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بارھویں صدی کا کوئی اطالوی یا عرب ملّاح ہوگا جس نے سب سے پہلے قطب نما سے کام لیا، لیکن وہ کوئی ہو اور کسی سرزمین کا رہنے والا ہو، اس حقیقت میں کوئی شُبہ نہیں کہ قطب نما کی ایجاد تاریخ کا نہایت ہی اہم واقعہ تھی۔

اس بارے میں بڑے افسانے مشہور ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ چین کے ایک بادشاہ کو حضرت مسیح علیہ السّلام سے دو ہزار چھ سو چونتیس برس پہلے دشمن سے لڑائی پیش آگئی۔ اتفاق سے فضا میں سخت کُہر پھیل گئی اور کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ فوج کو کس رُخ چلنے کا حکم دیا جائے۔ بادشاہ نے

ایک ایسی جنگی گاڑی بنوائی جس سے جنوبی سمت معلوم ہو سکتی تھی۔ بس اس گاڑی کی رہنمائی میں دشمن پر حملہ کیا گیا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ گاڑی مقناطیس کے اصول پر بنائی گئی تھی یا اس وقت تک اہل چین کو مقناطیس کے خواص کا علم ہو چکا تھا، لیکن چین میں قطب نما کے وجود کی پہلی شہادت ۱۲۹۷ء میں ملتی ہے۔

چینیوں کے بعد دُوسری قومیں بھی قطب نما بنانے کی مدعی ہیں۔ مثلاً عرب، یونانی، اطالوی وغیرہ۔ اس کا ذکر پہلی مرتبہ ایک انگریز الیگزانڈر نیکم[1] کی کتاب میں ملتا ہے جو بارھویں صدی میں لکھی گئی تھی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مارکوپولو نے مشرق کے سفر سے واپسی پر ۱۲۶۰ء میں یورپ کو قطب نما سے روشناس کیا تو صاف ظاہر ہے کہ یہ بات غلط ہے۔

مدت تک کسی کو مقناطیس کے اصول کا علم نہ تھا جس کی وجہ سے قطب نما کی سُوئی شمال کی طرف رہتی ہے (یا جنوب کی طرف جیسا کہ چینیوں نے اپنے حساب کے لیے مناسب سمجھا)۔

اسی طرح کسی کو یہ علم بھی نہ تھا کہ جغرافیائی قطب شمالی اور مقناطیسی قطب شمالی ایک دوسرے سے بالکل الگ اور جُدا گانہ ہیں۔ نیز یہ کہ مقناطیسی قطب شمالی ایک جگہ مستقل نہیں رہتا، بلکہ بدلتا رہتا ہے۔ مقناطیسی قطب شمالی نقشے پر پہلے پہل ۱۸۳۱ء میں متعین کیا گیا تھا۔

قطب نما میں فنی اصلاح کی رفتار اتنی سُست تھی کہ ۱۸۲۰ء میں بحریہ انگلستان کے پاس شکایت پیش ہوئی جس میں بتایا گیا تھا کہ بحریہ کے نصف سے زیادہ آلے بالکل بے کار ہیں۔

غرض قطب نما کی ایجاد نے انسانیت کی تاریخ اور نقل وحرکت پر جو اثرات ڈالے ان کا اندازہ مشکل ہے۔ افسوس نہ ہم یہ جانتے ہیں کہ اس کا موجد کون تھا اور نہ یہ جانتے ہیں کہ یہ آلہ کیوں کر ایجاد ہُوا۔

۱- Alexander Neckam

کولمبس نئی دُنیا دریافت کرتا ہے

جس طرح تاریخ کے بہت سے عظیم الشان کارنامے اکثر بلا ارادہ انجام پا گئے، اسی طرح کولمبس بھی بلاارادہ امریکہ پہنچ گیا۔ حالانکہ اس کی منزلِ مقصود ہندوستان تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے پانسو سال پیشتر ناروے کا ایک ملاح لیف[1] ایرک سن محض اتفاقیہ امریکہ پہنچ چکا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ بھی امریکہ نہیں، بلکہ آئس[2] لینڈ کے ارادے سے نکلا تھا۔

امریکہ کی دریافت پر کولمبس کو جو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی، اس کا سبب یہ ہے کہ جب اس نے سفر اختیار کیا تو زمانے کے حالات بدل چکے تھے۔ یورپ میں صلاحیت پیدا ہو چکی تھی کہ اس دریافت کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر کے اس سے پورا فائدہ اُٹھا سکے۔ ایرک سن کے عہد میں ایسی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ نئے برِّاعظم کی دریافت میں کولمبس کو پہلا درجہ دیا جائے یا نہ دیا جائے لیکن اس کی مستقل مزاجی، حوصلہ مندی اور بحری مہارت پر انگلی رکھنے کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی، نہ اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ نئی دنیا کے جنم لینے کا اصل دَور اس وقت سے شروع ہوا، جب سے کولمبس غرب الہند میں پہنچا۔

کولمبس چودہ سال کی عمر ہی سے بحری سفر کا عادی ہو چکا تھا۔ اس نے بحیرۂ روم کے چکّر لگائے، اوقیانوس کے جزائر میں پہنچا، انگلستان گیا، شمالی سمندروں میں پھرتا رہا۔ ۱۴۷۴ء میں اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ مغربی سمت سے ہندوستان کا راستہ دریافت کرنا چاہیئے۔ اس خیال نے ایک دُھن کی شکل اختیار کر لی۔ اٹھارہ سال تک نشیب و فراز کے کئی دَور اس پر آئے، لیکن وہ اپنی دُھن پر قائم رہا۔ آخر ہسپانیہ کے فرمانروا اس کی دست گیری کے لیے تیار ہو گئے۔ ۳ر اگست ۱۴۹۲ء کو وہ تین چھوٹے چھوٹے جہاز لے کر ولبہ[3] کی بندرگاہ سے روانہ ہوا۔ راستے میں اسے طوفانوں سے بھی سابقہ پڑا، بیماریاں بھی پیش آئیں،

۱- Leif Ericson ۲- Ice Land

۳- Huelva جنوبی ہسپانیہ کی مشہور بندرگاہ ہے۔ عرب اسے "ولبہ" کہتے تھے۔

ملاحوں کی سرکشی کا خوف بھی دامن گیر رہا، لیکن اس کے ارادے میں کوئی تزلزل پیدا نہ ہوا، یہاں تک کہ وہ مغربی سمت بڑھتا بڑھتا یکم اکتوبر کو بہاماز[1] کے ایک چھوٹے سے جزیرے سان سالواڈور[2] میں پہنچ گیا۔

بعدازاں اس نے نئی دُنیا کے تین اور سفر کیے۔ ان سفروں میں جزیرۂ ٹرینی ڈاڈ[3] کے علاوہ جنوبی امریکہ کا برّاعظم دریافت کیا، نیز خلیج میکسیکو کے جنوبی ساحل کی دیکھ بھال میں لگا رہا۔ اس نے دولت بھی خُوب کمائی اور شہرت بھی بہت حاصل کی۔ ایک مرتبہ بیڑیوں میں جکڑا ہوا بھی ہسپانیہ پہنچا اور مرنے کے بعد اس کے سر پر عظمت کا تاج رکھا گیا۔

اس کے متعلق بہت سے افسانے بھی تیار ہو گئے، مثلاً یہ کہ جو لوگ اس کے عزم سفر کی مخالفت کر رہے تھے انھیں قائل ہونا پڑا کہ زمین گول ہے، حالانکہ ان کا اختلاف سمندر کی چوڑائی کے متعلق تھا۔ انجام کار ثابت ہوا کہ کولمبس کے مقابلے میں ان کا حساب اصل سے زیادہ قریب تھا۔

ہمارے زمانے میں تجربات کے متعلق جو انکشافات ہوئے، ان سے فنِ جہاز رانی میں کولمبس کی مہارت کے حیرت انگیز ثبوت ملے۔ مثلاً ایک مرتبہ اس نے مشرقی سمت میں اوقیانوس کو عبور کیا اور جس مقام پر پہنچنا چاہتا تھا، وہ صرف پینتیس میل ایک طرف رہ گیا۔ لہروں اور ہواؤں پر قابو پائے رکھنے کا یہ بڑا ہی عجیب کارنامہ ہے خصوصاً جب یہ حقیقت پیش نظر رکھی جائے کہ اس کے پاس آلات بہت ہی معمولی حیثیت کے تھے تو کارنامے کی عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

بلاشبہ کولمبس سے پہلے بھی بہت سے گروہ امریکہ پہنچ چکے تھے اور اُنھوں نے مختلف حصّوں میں نوآبادیاں بھی قائم کر لی تھیں۔ ایلاسکا کی طرف سے بھی لوگ اس برّاعظم میں داخل ہو چکے تھے پھر وہ آگے بڑھتے بڑھتے وسطی امریکہ سے گزر کر جنوبی امریکہ میں پہنچ گئے، لیکن ان کی دریافت کے بعد وہاں وسیع پیمانے پر آبادکاری کا سلسلہ شروع نہ ہو سکا۔ کولمبس کی دریافت کے بعد یورپ اس نئے برّاعظم کی طرف اُمنڈ پڑا اور تھوڑی ہی مدت میں عام آبادکاری شروع ہو گئی۔ پھر امریکہ ہی میں اس جمہوریت کی داغ بیل پڑی جو آج ساری دُنیا کے لیے ایک مثال بنی ہوئی ہے۔ امریکہ ہی میں متحدہ ریاستوں کے اس نظام نے پرورش پائی جسے آج مال و دولت، صنعت و تجارت اور علم و فن میں سب پر فوقیت حاصل ہے۔

۱- Bahamas ۲- San Salvador آج کل اس جزیرے کا نام Wating Island ہے اور یہ مجمع الجزائر کے وسط میں واقع ہے۔ ۳- Trinidad

کُرۂ ارض کے گرد پہلا چکّر لگتا ہے

ستمبر ۱۵۱۹ء میں پانچ جہازوں کا ایک بیڑا میجی لن کی سرکردگی میں سان لوکر (جنوبی ہسپانیہ) کی بندرگاہ سے کرۂ ارض کا چکّر لگانے کے لیے روانہ ہوا۔ تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا سفر تھا۔ تین سال بعد اس بیڑے میں سے صرف ایک جہاز جس کا نام وِتوریا تھا، سان لوکر میں واپس آیا اور اس پر صرف اٹھارہ آدمی سوار تھے۔ گویا پورے بیڑے میں سے یہی ایک جہاز اور یہی تھوڑے سے آدمی باقی رہ گئے تھے۔

میجی لن امیر گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اتفاقیہ اس کے سر میں کرہ ارض کے گرد چکّر لگانے کا سودا سمایا۔ اس نے بحری سفر کا ایک نقشہ تیار کر کے شاہِ پرتگال کے سامنے پیش کیا، لیکن اسی زمانے میں میجی لن کے خلاف سرکاری روپے میں خرد برد کا الزام لگ چکا تھا، بادشاہ نے اس کی تجویز نامنظور کر دی۔ وہ اس ناکامی سے اتنا متاثر ہوا کہ پرتگیزی قومیت ہی ترک کر دی اور ۱۵۱۷ء میں ہسپانیہ چلا گیا، جہاں شاہ چارلس نے اس کی اسکیم کو منظور کر کے پانچ جہاز اس کے حوالے کر دیئے۔

ہسپانیہ سے روانہ ہو کر وہ دو مہینے اور نو دن میں اٹلانٹک کو عبور کر کے برازیل (جنوبی امریکہ) کی ایک بندرگاہ میں جا پہنچا۔ پھر وہ ساحل کے ساتھ ساتھ جنوبی سمت کو روانہ ہوا۔ سردیوں کا موسم پٹے گونیا کی ایک بندرگاہ میں گزارا۔ ۱۵۲۰ء کی آخری سہ ماہی میں اس نے پھر لنگر اٹھایا اور جنوبی امریکہ کے جنوبی گوشے میں تین سو ساٹھ میل لمبی آبنائے سے گزر کر بحرالکاہل میں داخل ہو گیا۔ یہ آبنائے بعد میں اسی کے نام پر موسوم ہوئی۔

اپنے بیڑے کے افسروں سے مشورے کے بعد وہ پھر روانہ ہوا۔ بحرالکاہل کے سفر میں اس کے آدمیوں کو فسادِ خون، بھوک اور پیاس کے ہولناک مصائب نے پریشان کیے رکھا، لیکن ہمّتِ مرداں مددِ خدا، اٹھانوے روز کی جدوجہد کے بعد وہ جزائر ماریاناز میں پہنچ گیا۔ وہاں سے اشیائے خور و نوش لے کر چلا تو ۷ راپریل ۱۵۲۱ء کو وسطی فلپینز کے مشہور مقام سیبو میں لنگر انداز ہوا۔ وہاں کے ایک مقامی سردار نے اہلِ ہسپانیہ کی ایک بہت بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ مقتولین میں خود میجی لن بھی تھا۔ صرف ایک جہاز وِتوریا سلامت وطن پہنچا۔

۱- Magellan ۲- Sanlucar یہ بندرگاہ وادیٔ کبیر کے دہانے پر ہے۔ ۳- Vittoria
۴- Marianas Island ۵- Cebu اس نام کا ایک جزیرہ بھی ہے اور شہر بھی۔
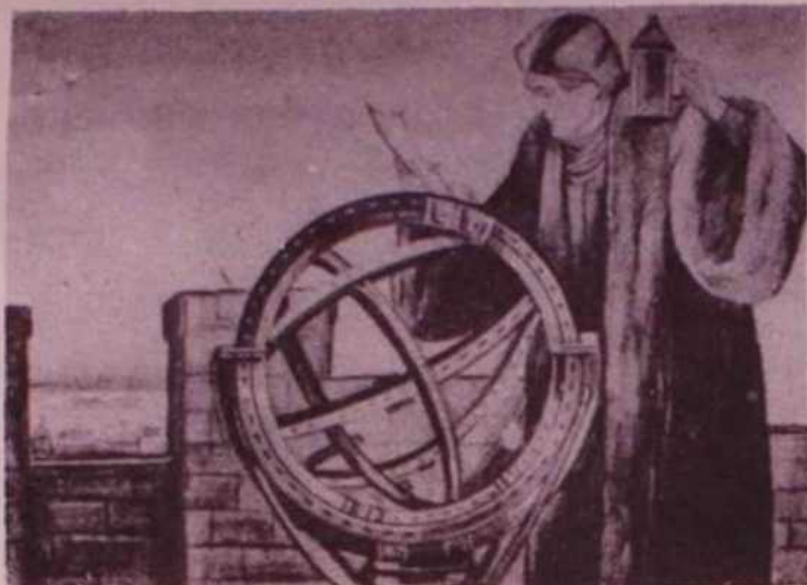
کوپرنیکس سورج کے گرد زمین کی گردش کا انکشاف کرتا ہے

جس زمانے میں میجی لن عملاً زمین کے گول ہونے کا ثبوت مہیا کر رہا تھا، اسی زمانے میں نکولس کاپرنیکس[1] ایک اور نکتہ ثابت کرنے میں لگا ہؤا تھا اور وہ یہ کہ زمین بھی دُوسرے سیاروں کی طرح سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ کاپرنیکس کو دُوسرے اہل علم کی طرح زمین کے گول ہونے کا یقین تھا اور اس نے جو نیا نکتہ دریافت کیا اس کے اثرات بھی بڑے ہی دُور رس تھے۔

کاپرنیکس ۱۹ فروری ۱۴۷۳ء کو تھورن[2] (پروشوی پولینڈ) میں پیدا ہؤا۔ کراکو[3] کی یونیورسٹی میں ریاضیات کی تعلیم پائی۔ پھر بولونا[4] جاکر بیک وقت عیسوی شریعت اور ہیئت پڑھتا رہا، حالانکہ ان دونوں میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ پاڈوا پہنچا تو اس کی توجّہ طبابت کی طرف منعطف ہوئی۔ تعلیم مکمل کر کے وطن واپس ہؤا تو طبابت شروع کر دی، ساتھ ساتھ کلیسا کے فرائض بھی انجام دیتا رہا، اگرچہ اس نے کلیسا سے باقاعدہ تعلق کبھی پیدا نہ کیا۔ علاوہ بریں اقتصادیات اور بنک کاری سے بھی دلچسپی لیتا رہا۔ اس نے سکّے میں اصلاح کی ایک منظم اسکیم پیش کی۔ فرصت کے اوقات میں وہ ہیئت کے نئے نظام پر غور و فکر کرتا رہتا جس کی وجہ سے کائنات کے متعلق انسانی فکر میں ایک نیا انقلاب پیدا ہو گیا۔

ہیئت دنیا کے قدیم ترین علوم میں سے ہے اور اسے بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ غیر مہذب لوگ بھی اجرام سماوی کے مشاہدے سے وقت اور موسم کا حال دریافت کرتے تھے۔

سب کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ زمین ہر شے کا مرکز ہے۔ تیسری صدی ق م میں جزیرہ ساموس[5] کے سائنسدان ایرسٹارکس[6] نے سب سے پہلے سورج کو مرکز قرار دیا۔ پھر ارشمیدس[7] نے اپنا نظریہ پیش کیا۔ ایک ہزار آٹھ سو سال بعد کاپرنیکس بھی اسی نتیجے پر پہنچا جس پر ارشمیدس پہنچا تھا۔ کاپرنیکس اس دَور میں پیدا ہؤا جسے یورپ میں احیائے علوم کا دَور کہا جاتا ہے۔ لوگ روایتی فکر و نظر کی زنجیریں توڑنے پر آمادہ ہو چکے تھے۔ لہٰذا کوپرنیکس کے انقلابی نظریے کے لیے قبول و پذیرائی کا موقع بن گیا۔

کوپرنیکس کو اپنی کتاب کا پہلا مطبوعہ نسخہ اپنی وفات (۲۴ مئی ۱۵۴۳ء) سے چند روز پیشتر ملا۔ اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کتاب پر بلا اجازت ایک مقدمہ لکھ کر اس کے بالغ نظرانہ استدلال کو محض ایک مفروضے کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ اس خوف سے کہ کہیں لوگ اس کی مخالفت میں سرگرم نہ ہو جائیں۔

Bologna -۴ Cracow -۳ Thorn -۲ Nicholas Copernicus -۱
Archimedes -۷ Aristarchus -۶ Samos -۵

امریکہ میں پہلا انگریزی شہر آباد ہوتا ہے

نئی دُنیا کی دریافت پر ایک صدی گزر چکی تھی، جب انگریزوں کو وہاں قدم جما کر بیٹھنے کا موقع ملا۔ یہی قدم گاہ آگے چل کر انگریزی آبادی کی اکثریت والے اس ملک کی شکل اختیار کر گئی، جسے آج کل ریاستہائے متحدہ کہتے ہیں۔ سر والٹر ریلے[1] اور بعض دوسرے لوگ ورجینیا کو آباد کرنے کے لیے سولھویں صدی میں جو کوششیں کر چکے تھے، وہ پائدار ثابت نہ ہوئیں، البتہ ورجینیا کا نام باقی رہ گیا۔ ۱۶۰۷ء میں دریائے جیمز کے کنارے جیمز ٹاؤن[2] کے نام سے جو بستی آباد ہوئی وہ شمالی امریکہ کے مشرقی حصّے میں انگریزی اقتدار کے پھیلاؤ کا مرکز بن گئی۔

لنڈن کمپنی نے آباد کاروں کی جو پہلی مہم بھیجی، وہ ۱۳ مئی ۱۶۰۷ء کو جیمز ٹاؤن میں پہنچی اور وسیع پیمانے پر کھیتی باڑی کا سلسلہ جاری کر دیا، جس کے دو مقصد تھے: اوّل یہ کہ زمین کی زرخیزی سے فائدہ اُٹھایا جائے، دوم یہ کہ ہسپانیہ کے مقابلے میں اپنا قبضہ مستحکم کر لیا جائے۔ لیکن آگے چل کر ثابت ہؤا کہ ہسپانویوں کے مقابلے میں امریکہ کے اصلی باشندے زیادہ خوفناک دُشمن تھے۔ زمین بلاشبہ بڑی زرخیز تھی، لیکن آب و ہوا نے جفاکش کاشتکاروں کو مضمحل کر کے رکھ دیا۔ مشکلات اتنی بڑھ گئیں کہ وہ لوگ واپس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اچانک جون ۱۶۱۰ء میں آباد کاروں کا نیا گروہ پہنچا۔ ان کے پاس سامان رسد بھی بافراط موجود تھا۔ پھر لہروں کی طرح پے در پے آباد کار آنے لگے۔ موسمی بخار اور دُوسری بیماریوں سے بھی بڑا نقصان ہؤا۔ اصلی باشندوں کے حملوں نے بھی بہت سے آباد کاروں کو مَوت کے گھاٹ اُتار دیا، لیکن آباد کاری کی

۱- Sir Walter Raleigh ۲- James Town

توسیع میں رکاوٹ پیدا نہ ہوتی۔ تمباکو کی کاشت اس قدر نفع بخش تھی کہ لوگ سارے نقصانوں سے بے پروا ہو کر اس میں لگ گئے۔ اگرچہ جیمز ٹاؤن میں چند سو سے زیادہ لوگ آباد نہ تھے لیکن چھوٹی چھوٹی بستیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور ورجینیا کی آبادی تیزی سے ترقی کرتی چلی گئی۔

اب ایک اور مصیبت پیش آئی۔ جیمز ٹاؤن انگلستان کی حکومت سے بہت قریب تھا اور وہاں بعض پُرانے خاندان آباد تھے، جنھوں نے اپنے لیے اقتدار کے خاص حقوق پیدا کر لیے تھے۔ جو لوگ دُور افتادہ سرحدوں پر رہتے تھے انھیں یہ صُورتِ حال پسند نہ تھی۔ ۱۶۷۶ء میں امریکہ کے اصلی باشندوں نے آباد کاروں پر حملہ کیا تو گورنر نے کوئی قابلِ ذکر امداد نہ دی۔ سرحدی آباد کاروں نے اپنی ہمت سے اس حملے کو روکا اور ناکام بنایا۔

بعد ازاں گورنر، اس کے حامیوں اور دوسرے آباد کاروں کے درمیان ایک قسم کی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ جس میں آباد کار کامیاب ہوئے۔ جیمز ٹاؤن کو آگ لگا دی گئی جس سے وہ تباہ ہو گیا۔

۱۶۹۹ء میں جیمز ٹاؤن کی جگہ ولیمز برگ[1] کو مرکزِ حکومت بنا لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ مرکزِ حکومت تبدیل ہو جانے کے بعد جیمز ٹاؤن کی پہلی حیثیت باقی نہ رہ سکتی تھی اور یہی صورت پیش آئی۔ جیمز ٹاؤن کا زوال اس پیمانے پر شروع ہوا کہ تین صدیاں گزر جانے پر اس شہر کی جگہ صرف ایک دودکش (چمنی) باقی رہ گیا۔

تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ امریکہ کی سرزمین میں جیمز ٹاؤن انگریزوں کا پہلا شہر تھا، یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا میں انگریزوں نے جو بے شمار شہر اور قصبے آباد کیے، ان میں سب سے پہلا یہی تھا۔

۱۔ Williamsburg

انسانی نظر بلندیوں اور گہرائیوں میں پہنچتی ہے

اگرچہ عینک سازی کا سلسلہ ۱۲۸۰ء سے عام طور پر جاری ہوچکا تھا، لیکن ان شیشوں سے کوئی اور کام لینے کی نوبت سوا تین سو سال پہلے تک نہ آئی۔ ۱۶۰۸ء میں ہالینڈ کے ایک عینک ساز نے اتفاقیہ دو شیشے ملا کر گرجے کے ایک مینار پر نظر ڈالی تو وہ حیران رہ گیا کہ مینار بہت قریب معلوم ہوتا ہے اور اس کی ایک ایک چیز صاف دکھائی دے رہی ہے۔ اس طرح اس پر دُوربین کا راز آشکارا ہوگیا اور اس نے دُوربین پیٹنٹ کرانے کے لیے درخواست دے دی۔ اسی طرح بعض اور لوگوں کے دل میں بھی دُوربین بنانے کا خیال پیدا ہُوا، لیکن اس سلسلے میں جو شہرت و ناموری اٹلی کے ایک معروف سائنسدان گلیلیو[1] کو حاصل ہوئی وہ کسی دُوسرے کے حِصّے میں نہ آئی۔

کہتے ہیں گلیلیو ۱۶۰۹ء میں وینس میں تھا کہ اس نے سُنا، بلجیم کے ایک شخص نے دُوربین بنائی ہے۔ گلیلیو نے یہ دُوربین دیکھی نہ تھی، لیکن انعطافِ نور کے اُصول پر غور کرتے کرتے اس نے چند روز میں ایک ایسا آلہ ایجاد کرلیا جو تمام دُوربینوں سے بدرجہا بہتر تھا۔ یہ آلہ اس نے حاکم وینس کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پیشکش کے صلے میں گلیلیو کو پاڈوا[2] کی یونیورسٹی میں مُدّت العمر کے لیے لکچرر مقرر کردیا گیا اور اس کی تنخواہ دُگنی ہوگئی۔

گلیلیو کی پہلی دُوربین میں ہر شے صرف تین گُنا دکھائی دیتی تھی، پھر اس نے ایسی دُوربین بنائی جس میں ہر شے تینتیس گنا دکھائی دیتی تھی۔

دُوربین کی طرح خوردبین کی ایجاد میں بھی گلیلیو کو ایسے ہی حالات سے سابقہ پڑا۔ دُوربین کی ایجاد سے کوئی چوبیس سال پیشتر زکریا جین سن[3] نام ایک عینک ساز نے مرکّب خوردبین تیار کرلی تھی جو چھوٹی چیزوں کے دیکھنے میں کام آتی تھی۔ یہ دراصل ایسے شیشوں کے دو جوڑوں کو ملا کر بنائی گئی تھی جن میں چھوٹی چیزیں بڑی دکھائی دیتی ہیں۔ جین سن کی خوردبین ۱۵۹۰ء میں تیار ہوچکی تھی۔ گلیلیو کی توجّہ ۱۶۱۰ء میں اس طرف منعطف ہوئی، لیکن اس نے اپنی دُوربین ہی کو ایسے انداز میں استعمال کرنے کا طریقہ دریافت کرلیا جس سے چھوٹی چیزیں بڑی نظر آئیں۔ ۱۶۲۴ء میں ڈریبل[4] کی خوردبین رومہ پہنچی تو گلیلیو مستقل خوردبین کی ایجاد پر متوجّہ ہُوا۔ اس نے اس آلے میں جو اصلاحات کیں، ان کی وجہ سے خوردبین کی کامیابی کا سہرا بھی اسی کے سر بندھا۔ اس طرح چند سال میں انسانی مشاہدے نے دو مختلف سمتوں میں وسعت اختیار کرلی اور نئی دنیاؤں کے چہرے سے پردے اُٹھ گئے۔

۱- Galileo ۲- Padua ۳- Zacharias Jansen ۴- Drebel

دورانِ خون کا اصول دریافت ہوتا ہے

ولیم ہاروے[1] ایک مشاق اور محنتی طبیب تھا۔ سترھویں صدی کے اوائل میں وہ گھوڑے پر سوار ہو کر چکر لگاتا اور مریضوں کا علاج کرتا۔ اس نے یہ راز دریافت کیا کہ دل ایک پمپ ہے جس کی بدولت خون شریانوں اور رگوں کے راستے سارے جسم میں دَورہ کرتا رہتا ہے۔ انسان کے لیے یہ شاید نہایت اہم انکشاف تھا۔

انسانوں میں جب سے الفاظ کے شاعرانہ دروبست کا سلسلہ جاری ہوا، عشق و محبت اور ہمت و جوانمردی کے داستاں سرا دل کو جذبات کا مرکز قرار دیتے رہے۔ ہاروے کے اس اہم انکشاف نے آج بھی دل کے اس شاعرانہ تصور پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ اگرچہ ہر صدی کے جنگجو اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ دل میں تلوار کی نوک کا ایک کچو کا بھی فوری موت کا باعث ہوتا ہے، لیکن ارسطو یا جالینوس یا ہیروفلس[2] یا سولھویں صدی کے کسی روشن دماغ ڈاکٹر کو دورانِ خون کا نظام تیار کرنے کی نہ سوجھی۔ ہاروے کو یہ نکتہ سوجھ گیا۔ اسی سرسری خاکے پر دورِ حاضر کے علمِ طب کا بڑا حصہ تیار ہوا۔ ہاروے کے زمانے میں خوردبین موجود نہ تھی۔ اس لیے وہ بال جیسی باریک رگوں سے آگاہی حاصل نہ کر سکا جنھیں عروق شعریہ کہتے ہیں، لیکن اس نے دَورانِ خون کا جو نظریہ پیش کیا وہ آج کل اسکولوں میں تعلیم پانے والے بچّوں کو بھی معلوم ہے اور یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ سترھویں صدی سے پیشتر یہ نظریہ موجود نہ تھا۔ اس کے بغیر وہ معجز کاریاں کیونکر ظہور میں آسکتی تھیں جو رات دن ہمارے گردوپیش ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً ٹیکے، نازک جراحی عمل، گندھک کی دوائیں، پنسلین یا فسٹ ایڈ کے سلسلے میں خون روکنے والے آلوں کا استعمال۔

ولیم ہاروے پہلے کیمبرج میں پڑھتا رہا۔ پھر اٹلی کی یونیورسٹی پاڈوا میں داخل ہو گیا جو

---

[1] William Harvey [2] Herophilus

اس زمانے میں یورپ کی بہترین طبی درسگاہ تھی۔ ۱۶۱۶ء سے اس نے دورانِ خون کے متعلق لکچر دینے شروع کیے۔ ۱۶۲۸ء میں اس موضوع پر اپنی کتاب شائع کی۔ ساتھ ساتھ طبابت بھی کرتا رہا۔ وہ شاہ جیمس اول اور شاہ چارلس اوّل کے علاوہ ان کے بعض درباریوں کا بھی طبیب خاص تھا۔ اس نے بڑے بڑے جراحی کے عمل کیے، جن کی پوری کیفیت لکھی ہوئی موجود ہے۔ ۱۶۳۵ء میں ٹامس پار[1] نے وفات پائی جس کی عمر ایک سو باون برس بتائی جاتی تھی۔ بادشاہ کے حکم سے ہاروے نے پار کی لاش کا بھی طبی معائنہ کیا، لیکن جس علاج نے دورانِ خون کے متعلق ہاروے کے نتائج کا روشن ثبوت مہیا کیا وہ ایک ایسے بیمار کا علاج تھا جس کی رسولی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ ہاروے نے ان تمام رگوں کے منہ باندھ دیئے، جن کے ذریعے رسولی تک خون پہنچ رہا تھا۔ اس طرح نہ صرف رسولی کا بڑھنا ہی رُک گیا بلکہ وہ آہستہ آہستہ خشک ہو کر بالکل ناپید ہو گئی اور مریض اچھا ہو گیا۔

۱- Thomas Parr
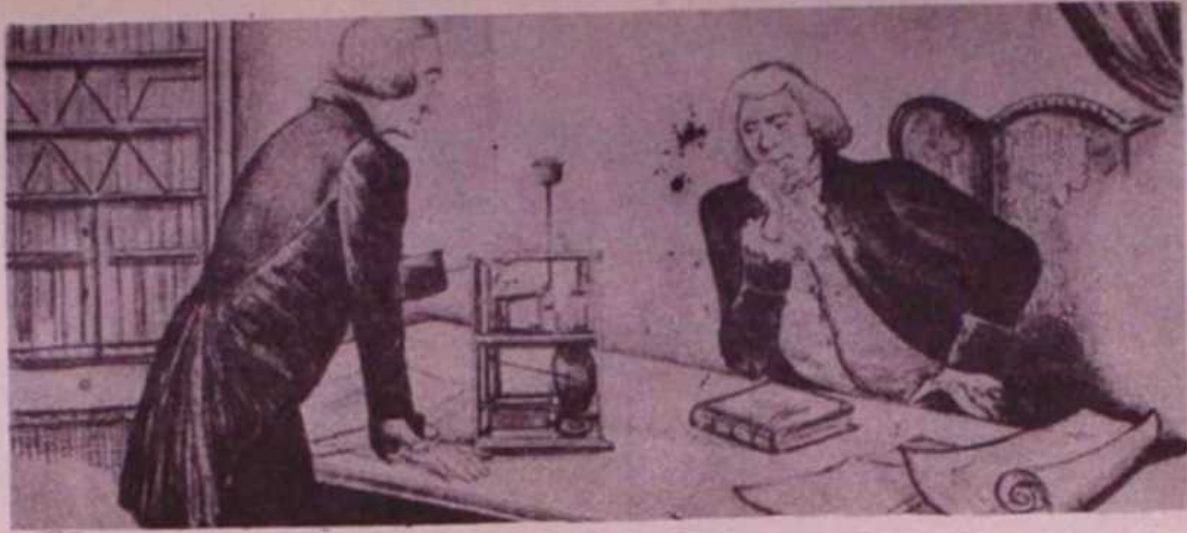
بھاپ کا اِنجن تیار کیا جاتا ہے

ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ معمولی مشینوں کی مرمّت کرنے والا کوئی شخص اپنے کسی عجیب و غریب کارنامے سے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دے، لیکن ۱۷۶۴ء میں بمقام گلاسکو (اسکاٹ لینڈ) ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا۔

بھاپ کے انجن کا خیال یا خود انجن کوئی انوکھی چیز نہ تھی۔ ایسی مشینیں بن چکی تھیں جو کوئلے کی کانوں سے پانی باہر نکالنے کے کام آتی تھیں اور بھاپ سے چلتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک کان کی مشین میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی۔ جیمس ویٹ سے کہا گیا کہ اُسے دُرست کر دے۔ اس وقت ویٹ کی عمر اٹھائیس سال کی تھی اور وہ لندن میں اوزار بنانے کا کام سیکھ چکا تھا۔

ویٹ کو مشین کی دُرستی میں تو کوئی خاص دقّت پیش نہ آئی، لیکن مشین کو دیکھ کر اس کے دماغ میں بھاپ کے انجن کا وہ خیال تازہ ہو گیا جو تین سال پیشتر اس کا محبوب خیال تھا۔ مشین کا معائنہ غور سے کیا تو ویٹ کو اندازہ ہو گیا کہ اس میں بھاپ بہت زیادہ خرچ ہوتی ہے لہٰذا اسے کفایت شعاری سے نہیں چلایا جا سکتا۔ وہ مشین میں نئی نئی ترمیمیں سوچتا رہا، تاکہ خرچ میں کمی کی صورت نکل آئے۔ سوچتے سوچتے اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ جو انجن اب تک بنائے گئے ہیں ان میں سلنڈر (بیلن) کے ذریعے ایک غیر ممکن کام انجام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ جمع شدہ بھاپ کا درجۂ حرارت بہ حالت عمل کم ہونا چاہیئے، البتّہ سلنڈر (بیلن) کو اتنا ہی گرم ہونا چاہیئے جتنی اس میں داخل ہونے والی بھاپ گرم ہوتی ہے۔ غرض اس نے ایک نئی چیز تیار کر دی جس کا نام آلۂ تکثیف (کنڈنسر) ہے۔ اس کیلئے پانی سے ٹھنڈا ہوتے رہنے کا انتظام کر دیا اور سلنڈر (بیلن) کو بدستور گرم رہنے دیا۔ اس اصول کے مطابق نیا انجن بنایا تو اس کی مرضی کے مطابق کام دینے لگا۔ اس میں پہلے انجن سے ایک چوتھائی یا اس سے بھی کم بھاپ خرچ ہوتی تھی۔

بعد ازاں ویٹ نے اپنے انجن میں مزید اصلاحیں کیں اور ان تمام اصلاحوں کے پیش نظر اسے بھاپ کے انجن کے موجد کا اعزاز دے دینا ہرگز غیر مناسب نہ ہوگا۔ اس انجن کو حمل و نقل، صنعت و حرفت اور بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔

امریکی ریاستیں آزادی کا اعلان کرتی ہیں

امریکی ریاستوں کی کانگرس کا ایک اجلاس ۴ رجولائی ۱۷۷۶ء کو فلاڈلفیا میں ہوا، جس میں برطانیہ سے آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ امریکہ میں یہ دن ہر سال دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور بڑی خوشیاں کی جاتی ہیں۔ یہ اعلان ٹامس جیفرسن[1]، جان ایڈمز[2] اور بنجمن فرینکلن[3] نے تیار کیا تھا۔

اس سے بہت پہلے پانسا پھینکا جا چکا تھا۔ امریکی ریاستیں برطانیہ سے لڑائیاں کر چکی تھیں۔ ان میں جو خون بہا، اس کا تقاضا یہی تھا کہ تاج برطانیہ کے خلاف بغاوت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے، لیکن ایک گروہ کے نزدیک آزادی میں طرح طرح کے خطرے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر شاہی حکومت اُٹھ گئی تو ریاستوں کے درمیان اتحاد قائم نہ رہ سکے گا۔ جمہوری خیالات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مساوات ترقی کرے گی۔ عوامی حکومت کی وجہ سے بدنظمی پھیلے گی اور جو جائدادیں اُنھوں نے پیدا کی تھیں وہ چھن جائیں گی۔ اگرچہ برطانوی لشکروں سے لڑائیاں ہو رہی تھیں، لیکن اس خیال کے لوگ علیحدگی کے لیے تیار نہ تھے اور فلاڈلفیا کے اجلاس میں مہینوں اپنے خطرات شدّت سے پیش کرتے رہے۔

دُوسری طرف آزادی پسند لوگ ان خطرات کو بے بُنیاد قرار دیتے رہے تھے۔ اس سلسلے میں ٹامس پین کے ایک پمفلٹ "کامن سنس" (عقل سلیم) نے عوام کے خیالات پر بہت اثر ڈالا، لیکن تیرہ ریاستوں کے نمائندوں کے درمیان اختلاف باقی رہا۔ انجام کار ۱۰ رجون ۱۷۷۶ء کو اس امر پر اتفاق ہو گیا کہ تین ہفتے کے بعد آخری فیصلے کے لیے ووٹ لے لیے جائیں۔ اس زمانے میں جیفرسن، ایڈمز اور فرینکلن نے بڑا کام کیا۔ یکم جولائی کو ووٹ لیے گئے تو نو ریاستوں کے نمایندوں نے آزادی کے حق میں اور دوسرے نمایندوں نے خلاف ووٹ دیتے۔ ایک ریاست کے نمایندوں میں سے نصف ایک طرف تھے اور نصف دوسری طرف۔ ایک ریاست کا نمایندہ اس وجہ سے کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کوئی قطعی ہدایت نہیں ملی تھی۔ بڑی کوششوں سے ۲ رجولائی کو تمام نمایندے اعلانِ آزادی پر متفق ہو گئے اور ۴ رجولائی کو اعلان

۱- Thomas Jefferson ۲- John Adams ۳- Benjamin Franklin

جاری کر دیا گیا۔ اس کے تمہیدی حصے کا ترجمہ ذیل میں درج ہے :۔

"جب عالم انسانیت کے احوال و وقائع کی رفتار کے پیشِ نظر ضروری ہوجاتا ہے کہ جن سیاسی رابطوں نے ایک قوم کو دوسری سے وابستہ کر رکھا ہے، انھیں توڑ دیا جائے، قوانین قدرت اور خدائے کائنات کی طرف سے اس قوم کو اقوامِ عالم میں استقلال اور مساوات کے جو حقوق حاصل ہیں انھیں سنبھال لیا جائے تو انسانیت کی رائے عامہ کے احترام کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ان اسباب کو واضح کر دیا جائے جو علیحدگی کا موجب بنے۔

"یہ سچائیاں کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ خدا نے سب انسانوں کو ایک سا پیدا کیا اور سب کو وہ حقوق یکساں طور پر حاصل ہیں جنھیں چھینا نہیں جاسکتا۔ انھیں حقوق میں زندگی، آزادی اور حصولِ راحت بھی شامل ہیں۔ انھیں حقوق کی حفاظت کے لیے حکومتیں قائم کی جاتی ہیں، جو عوام کی رضامندی سے مناسب اختیارات کی مالک بنتی ہیں۔ جب کوئی حکومت ان مقاصد کی بربادی کا موجب بن جاتی ہے تو عوام کا حق ہے کہ اسے بدل دیں یا ختم و منسوخ کر دیں اور نئی حکومت بنائیں۔ اس کی بنیاد ایسے اصول پر رکھیں اور اسے ایسے انداز میں منظم کریں جو ان کے نزدیک حفاظت و راحت کے نقطۂ نگاہ سے مناسب ہو۔ احتیاط و تدبیر کا تقاضا یقیناً یہی ہے کہ جو حکومتیں مدت سے قائم چلی آتی ہیں، انھیں معمولی اور عارضی حالات کی بنا پر نہ بدلا جائے۔ تجربہ بھی شہادت دے رہا ہے کہ انسان مصیبتیں جھیل لیتے ہیں، بشرطیکہ انھیں جھیل لینا ممکن ہو، مگر جس طرزِ حکومت کے عادی ہوجائیں اسے بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ لیکن جب خرابیاں لامتناہی ہوجائیں، حقوق کا غصب جاری رہے اور ایسے طریقے اختیار کیے جائیں جن سے واضح ہو کہ عوام کو مطلق العنانی کا شکار بنائے رکھنا منظور ہے تو ایسی حکومت کا جُوا اُتار پھینکنا عوام کا حق ہی نہیں، بلکہ ان کا فرض ہوجاتا ہے۔ ضروری ہے کہ ایسے حالات میں اپنی آیندہ حفاظت کے لیے انتظامات عمل میں لائے جائیں۔

"ان نوآبادیوں نے بڑے صبر سے فرمانبرداری کا حق ادا کیا۔ اب ضرورت کے مطابق وہ سابقہ نظامِ حکومت کو بدلنے پر مجبور ہوگئی ہیں۔ موجودہ شاہِ برطانیہ کی سرگزشت دراصل نقصان پہنچانے اور حقوق غصب کرنے کی سرگزشت ہے۔ مدعا یہ تھا کہ ان ریاستوں پر کامل استبداد کا نظام جاری کر دیا جائے۔ اس کے ثبوت میں ہم انصاف پسند دنیا کے سامنے حقائق پیش کرتے ہیں۔"

انقلابِ فرانس کا پرچم کھلتا ہے

فرانس میں جس ہنگامے کا خطرہ مدت سے لگا ہوا تھا، وہ ۱۴ر جولائی ۱۷۸۹ء کو پیرس میں برپا ہوگیا۔ عوام نے بستیل[1] کے قید خانے پر یورش کرکے گورنر کو قتل کر دیا اور قید خانے کی تاریک کوٹھڑیوں میں جو سات قیدی بند تھے، انھیں رہائی دلادی۔ دراصل عوام سامانِ جنگ کے خواہاں تھے، لیکن یہ مقصد بھی ان کے پیش نظر تھا کہ اس پرانے قلعے پر قبضہ جمالیں، جو قید خانے کی حیثیت میں جبر و استبداد کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔ یہ ہنگامہ عوام کے دبے ہوئے جذبات کی بارود کے لیے فتیلہ بن گیا اور اس سے دھماکوں کا وہ وسیع سلسلہ جاری ہوا جسے انقلابِ فرانس کہا جاتا ہے۔

اصول پر نظر رکھی جائے تو یہ انقلاب دراصل صنعتی انقلاب کا شاخسانہ تھا۔ ترقی پذیر متوسط طبقہ سیاسی اور اقتصادی اختیارات حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ امیروں نے جاگیرداری کے سلسلے میں جو خاص حقوق حاصل کر لیے تھے، اگرچہ وہ بے موقع ہو چکے تھے، تاہم ان کی وجہ سے عوام کے لیے رسائیوں کا دروازہ بند تھا۔ کسان اور مزدور بھوکوں مر رہے تھے اور محاصل کا بوجھ بھی انھی پر پڑا ہوا تھا۔ امرا رنگ رلیاں منا رہے تھے اور ان سے سرکاری خزانے کی کوئی رقم نہ ملتی تھی۔ بادشاہ حد درجے کمزور تھا۔ اس سے یہ امید نہ رکھی جاسکتی تھی کہ وہ کسانوں اور مزدوروں کو مطمئن رکھنے کی غرض سے پرانے دستور میں مناسب ردوبدل کر دے گا، لہٰذا عوام اُٹھے اور انھوں نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

۱۷۸۹ء میں بادشاہ نے وہ قانون ساز مجلس[2] بلائی جس میں امیروں، پادریوں اور عوام کے نمائندے شریک تھے۔ ۱۶۱۴ء سے اس کا کوئی اجلاس نہ ہوا تھا۔ مجلس کا اصل کام یہ تھا کہ شکایتیں بادشاہ کے علم میں لائے اور اصلاحات کی مناسب تجاویز پیش کرے۔ پہلے ہی اجلاس میں تینوں طبقوں کے نمائندوں نے مختلف امور پر اتفاق کر لیا، اگرچہ تینوں کا نقطۂ نگاہ بالکل الگ الگ تھا۔ مثلاً تینوں چاہتے تھے

۱- Bastille اس کا صحیح فرانسیسی تلفظ بستی ہے، لیکن میں نے عام انگریزی تلفظ استعمال کیا ہے۔
۲- اس سے مراد States - General ہے۔

کہ دستور لکھ لیا جائے اور بادشاہ کے اختیارات پر پابندی لگادی جائے۔ تینوں کی خواہش تھی کہ اس مجلس کے ذریعے سے ٹیکسوں کا فیصلہ ہو۔ نیز تینوں اس مالی نظام کی مخالفت پر ہم آہنگ تھے جو ملک کو اقتصادی تباہی کی طرف لے جا رہا تھا۔

لیکن تینوں کے درمیان ووٹ دینے کے طریقے پر کشمکش شروع ہوگئی۔ عوام کے نمائندے چاہتے تھے کہ سب لوگ یکجا ووٹ کریں۔ اس طرح انھیں بے پناہ اکثریت حاصل ہوتی تھی۔ امراء اور پادریوں کی خواہش تھی کہ تینوں طبقوں کے ووٹ الگ الگ لیے جائیں اور طبقوں کی بنا پر آخری فیصلہ کیا جائے۔ اس صورت میں عوام کے نمائندے بے بس رہ جاتے تھے۔ چھ ہفتوں تک کام رُکا رہا۔ آخر عوام کے نمائندوں نے اعلان کر دیا کہ قوم کی ترجمانی کا حق صرف ہمیں حاصل ہے اور وہ قانون منظور کرنے میں لگ گئے۔ پہلی قرارداد یہ تھی کہ ان کی منظوری کے بغیر کوئی نیا ٹیکس نہ لگایا جائے۔

بادشاہ نے اس عمارت کو قفل لگوا دیے، جس میں اجلاس منعقد ہو رہے تھے۔ عوامی نمائندوں نے ایک محل کے اس حصے میں اجلاس شروع کر دیئے، جہاں ٹینس کھیلا جاتا تھا اور حلف اُٹھا لیا کہ جب تک دستور منظور نہ کرالیں گے، منتشر نہ ہوں گے۔ فوج نے ان کے خلاف کوئی قدم اُٹھانے سے انکار کر دیا تو نچلے درجے کے امراء اور پادری بھی ان میں شامل ہو گئے۔ بادشاہ نے غیر ملکی فوجی دستے بلالیے، تاکہ شہر پر قبضہ جمالیا جائے۔ عوام نے فوجوں کو ہٹا لینے کا مطالبہ پیش کر دیا، لیکن بادشاہ نہ مانا۔ اس پر اہل پیرس نے مجلس قانون ساز کی حفاظت کے لیے ایک زبردست قومی گارد تیار کر لی۔ اسی رنگارنگ فوج نے بیستل پر یورش کر دی۔

قومی نمائندوں کو امداد کا یقین ہو گیا تو انھوں نے سمجھ لیا کہ انقلاب کی راہ میں جو قدم اٹھایا گیا ہے وہ ضرور کامیاب ہوگا۔

بیستل کی تسخیر کے بعد کسان مفصلات میں امیروں کے بنگلے جلانے اور انھیں خوف زدہ کرنے لگے۔ پیرس میں انتہا پسندوں کے درمیان کھینچ تان شروع ہوگئی۔ عوام پر کسی کو قابو نہ رہا۔ بادشاہ اور ملکہ گرفتار ہوئے۔ بعدازاں وہ اور ہزاروں امراء مارے گئے۔ خیالات و افکار نے وحشت کا ایسا رنگ اختیار کر لیا کہ آج ایک دستور بنا اور کل اسے توڑ دیا جاتا۔ مذہب پر حملے شروع ہوگئے۔ کلیسا کے اوقاف قومی ملکیت قرار پائے۔ مالی مشکلات میں اضافہ ہوتا رہا۔ انقلابیوں کی زیادتیوں کے باعث آسٹریا اور انگلستان سے لڑائی چھڑ گئی۔

شورشوں، خونریزیوں اور وحشت آرائیوں سے فرانس اتنا تنگ آگیا کہ ۱۷۹۹ء میں نپولین نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ نپولین کے عہدِ اقتدار میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انقلابیوں نے مساوات کے جو خواب دیکھے تھے وہ سب پریشان ہوگئے، لیکن ایک لحاظ سے نپولین کی فوجی مہموں کے ذریعے سے انقلابی خیالات جگہ جگہ پھیلے۔ عوام کئی چیزوں کے لیے تیار ہوگئے۔ فرانس میں جاگیرداروں کا پرانا نظام درہم برہم ہوگیا۔ اس کی جگہ نپولین کے ضوابط نے مجلسِ انصاف کا انتظام کر دیا۔ متوسط طبقہ جن اختیارات کا خواہاں تھا، وہ اسے مل گئے۔ پیرس یورپ بھر کے لیے آزاد خیالات کا سرچشمہ بن گیا۔ یہاں تک کہ انقلاب کے انتہا پسندانہ پرولتاری افکار بھی تازہ رہے۔ مارکس اور اینجلز کی اشتمالی تحریرات نے انھیں پیرس ہی سے دُنیا بھر میں پھیلایا۔

رُوئے زمین پر ریلیں دَوڑتی ہیں

اگر رچرڈ ٹریوی تھک[۱] کو اچھے قانون دان مِل جاتے تو وہ بھاپ کے انجنوں سے سر جمیس ویٹ کے مقابلے میں زیادہ دولت کما لیتا۔ اگر ریل کی اچھّی پٹڑیاں تیار کرنے کی زحمت برداشت کر لیتا تو وہ ریل کے لیے بھاپ کے انجن بنانے میں جارج سٹیفن سن سے زیادہ شہرت و عظمت کا مالک بن جاتا۔ ہُوا یہ کہ اس نے ویٹ کے انجن سے بہتر انجن بنایا لیکن ویٹ کی طرح وہ اسے مالی لحاظ سے منفعت بخش نہ بنا سکا۔ اس نے سٹیفن سن سے دس سال پیشتر نہایت عمدہ لوکوموٹو انجن تیار کر دیا، لیکن اس کے لیے جو پٹڑیاں بچھائیں وہ بار بار خم کھا جاتی تھیں۔ اس نے پٹڑیوں کی دُرستی اور اصلاح پر توجہ کرنے کے بجائے یہ لائن ہی چھوڑ دی اور انجنیئری کا عام کام شروع کر دیا۔

ویٹ نے زیادہ دباؤ کی بھاپ کا استعمال خطرناک بتایا تھا۔ ٹریوی تھک اپنے تجربات میں لگا رہا اور اس نے ایک سادہ انجن تیار کر دیا جس پر خرچ بھی زیادہ نہ ہوتا تھا۔ ۱۸۰۰ء میں اسے رجسٹر بھی کرا لیا۔ ۱۸۰۲ء میں اس نے یہ انجن گاڑیاں کھینچنے کے لیے استعمال کیا۔ تجربے میں اسے شاندار کامیابی حاصل ہوئی، لیکن اچانک اس نے انجن ایک آدمی کے ہاتھ فروخت کر دیا اور گاڑیاں دُوسرے کو دے دیں۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی تھی کہ ٹریوی تھک میں استقلال کا جوہر موجود نہ تھا یا یہ سمجھنا چاہیے کہ اسے ان چیزوں سے جو دلچسپی پیدا ہوئی تھی وہ یکایک زائل ہو گئی۔

اس نے پہلی ریل ویلز میں چلائی۔ انجن میں چالیس پونڈ کے دباؤ کی بھاپ استعمال کی گئی۔ گاڑیوں پر دس ٹن بوجھ لدا ہُوا تھا۔ مسافر بھی بیٹھے تھے۔ کوئلہ بھی تھا جو انجن میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ انجن پانچ چھ میل کی رفتار سے چلا اور یقیناً یہ بہت بڑی کامیابی تھی لیکن پٹڑیاں اچھی نہ تھیں، اس لیے بار بار انجن اور گاڑیاں پٹڑیوں سے اُتر جاتیں۔ ٹریوی تھک اس سے تنگ آ گیا۔ لہٰذا اس کا انجن ایک کان سے پانی باہر نکالنے کے کام میں لگا رہا اور ریل گاڑیاں بنانے کا اعزاز جارج سٹیفن سن کے لیے مخصوص ہو گیا۔

۱- Richard Trevithick

ایتھر جرّاحی میں انقلاب پیدا کرتا ہے

جمہوریۂ امریکہ کی ریاست جارجیا میں جیفرسن[1] ایک قصبہ ہے۔ وہاں کے ایک آدمی کی گردن پر رسولی تھی۔ ڈاکٹر کرافورڈ لونگ[2] نے ۳۰ مارچ ۱۸۴۲ء کو اس پر جرّاحی کا عمل کیا اور رسولی کی جگہ کو سُن کرنے کی غرض سے ایتھر سے کام لیا۔ عمل جرّاحی کامیاب ہوا اور مریض کو اس دوران میں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ جراحی کے لیے جسم کے مختلف حصّوں کو سُن کرنے کی غرض سے ایتھر کے استعمال کا یہ پہلا تجربہ تھا۔

ڈاکٹر کرافورڈ کو اس جدّت کے لیے کوئی اعزاز حاصل کرنے کا خیال نہ آیا۔ غالباً اسے احساس ہی نہ ہوا کہ ایک خاص کارنامہ انجام پا گیا ہے، لیکن ۱۸۴۹ء میں جب دو دندان سازوں ہوریس ویلز[3] اور ولیم مورٹن[4] کے درمیان ایتھر کے استعمال میں پہل کرنے کے متعلق بحث چھڑی تو ڈاکٹر کرافورڈ بھی اس بحث میں شامل ہو گیا۔

ایتھر ۱۵۴۰ء سے ایک عام نشہ آور شے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جارجیا کے باشندے اسی طرح اکٹھے بیٹھ کر اسے سانس کے ساتھ چڑھایا کرتے تھے، جس طرح وہ بعد میں کاک ٹیل پینے لگے۔ اس زمانے میں عمل جرّاحی کے وقت درد سے محفوظ رہنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ وِسکی یا دوسری شرابیں پی لی جاتیں یا افیون کا شیرہ استعمال کیا جاتا یا ہپناٹزم سے کام لیا جاتا۔ رسولی کے مریض درد اور تکلیف کے خوف سے عمل جراحی نہ کراتے تھے۔ ڈاکٹر کرافورڈ کے پاس رسولی کا مریض آیا تو اس نے وسکی پینے کے بجائے ایتھر سونگھنے کا مشورہ دیا، مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ دونوں کے اثر میں کتنا بڑا فرق ہے۔

مشہور دندان ساز ہوریس ویلز نے ۱۸۴۴ء میں عمل جراحی کے مقام کو سُن کرنے کے لیے ہنسانے والی گیس (نائٹرس آکسائڈ گیس) کے تجربے کیے اور جنوری ۱۸۴۵ء میں اعلان کر دیا کہ بوسٹن میں اس کا عام مظاہرہ ہوگا۔ چنانچہ دانتوں کے ایک مریض پر یہ

۱- Jefferson ۲- Crawford Long ۳- Horace Wells ۴- William Morton

گیس استعمال کی گئی۔ سُوء اتفاق سے مریض کراہتا رہا۔ تماشائیوں نے سمجھا کہ وہ درد کی وجہ سے کراہ رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ویلز کے دعوے کو غلط قرار دے دیا۔ ۱۸۴۶ء میں مورٹن نے ایتھر کے تجربات بوسٹن ہی میں پیش کیے جو زیادہ کامیاب ثابت ہوئے۔ ۱۸۴۷ء میں اسکاٹ لینڈ کے ڈاکٹر سر جیمز ہمپسن نے کلوروفارم استعمال کیا۔

غرض اس سلسلے میں بہل کے دعووں اور ان کی تردید کے بارے میں دیر تک ہنگامہ بپا رہا۔ ویلز نے اپنے اُوپر بے ہوش کرنے والی دواؤں کے اتنے تجربے کئے کہ اسے کلوروفارم کی لت پڑ گئی اور جیل میں خودکشی سے اس کی موت ہوئی۔ دوسروں نے بے حسی پیدا کرنے والی ان دواؤں کے بنانے کے خاص حقوق حاصل کر کے انھیں اپنی تجوریاں بھرنے کا ذریعہ بنا لیا، لیکن عالم انسانیت کو اِن دواؤں سے بہر حال فائدہ ہی پہنچا۔ جراحی کے جو عمل پندرہ منٹ سے زیادہ دیر تک جاری رہتے، ان کی دہشت عموماً مہلک ثابت ہوتی۔ بے حسی یا بے ہوشی پیدا کرنے والی دواؤں کے استعمال سے زیادہ پیچیدہ عمل جراحی میں بھی زندہ رہنے اور جانبر ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے، اس لیے کہ مریض کو درد اور تکلیف کا کوئی احساس نہ ہوتا تھا۔

غور فرمایئے یہ کتنا عجیب واقعہ ہے کہ طِب مشرق میں جرّاحی وہ درجۂ کمال حاصل نہ کر سکی جو ہمارے زمانے میں اس نے طب مغرب میں حاصل کر لیا۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ جرّاحی میں جو تکلیف ہوتی تھی، اس سے مریض کو محفوظ رکھنے کی کوئی تدبیر نہ تھی اور لوگ تکلیف کے خوف سے یا تو علاج کرتے ہی نہ تھے یا دورانِ جراحی میں مر جاتے تھے۔ مغربی جرّاحوں نے آہستہ آہستہ جسم کو سُن کرنے یا مریض کو تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش کر دینے والی دوائیں ایجاد کر لیں۔ اس کے برعکس طب مشرق میں ایسی دواؤں کی ایجاد پر توجّہ جمی رہی، جن سے جرّاحی کے بغیر ہی فائدہ ہو جائے۔ مثلاً طب مشرق میں اب بھی ایسی دوائیں موجود ہیں، جن سے رسولیاں یا ورم تحلیل ہو جاتے ہیں۔ پھر مالش کے فن کو کمال پر پہنچا دیا گیا۔ ایسے مالشیئے ہم نے خود دیکھے ہیں جو ٹوٹے ہُوئے یا ہلے ہُوئے جوڑوں کو مالش کے ذریعے سے درست کر دیتے تھے، شاید اب بھی موجود ہوں۔

سمندر کی گہرائیوں میں تار بچھتا ہے

سیموئل مورس نے ۱۸۴۴ء میں تار برقی کے سلسلے کو کامیاب بنا دیا تھا۔ دس سال بعد امریکہ کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ اٹلانٹک میں سے تار گزار کر یورپ اور امریکہ کے درمیان برقی خبر رسانی کا سلسلہ قائم کر دے۔ اس کا نام سائرس ڈبلیو فیلڈ[1] تھا۔

اس سلسلے میں پہلی ضرورت یہ تھی کہ ایسے آلے تیار کر لیے جاتے جو سمندر میں سے گزرنے والے تار پر اتنے لمبے فاصلے سے برقی اشارے ایک دوسرے تک ٹھیک ٹھیک پہنچا سکتے۔ یہ مشکل یوں حل ہو گئی کہ لارڈ کیلون[2] نے شیشے کا مقناطیسی برق پیما تیار کر دیا۔ پھر ہزاروں میل لمبا مضبوط اور لچک دار تار تیار کرنا ضروری تھا جس پر گٹا پارچا چڑھا ہوا ہو، تاکہ بجلی کی لہریں اندر محفوظ رہتیں اور گٹے پارچے کے اوپر پیتل کا ایسا خول چڑھا دیا جاتا جس میں کوئی سمندری جانور سوراخ نہ کر سکتا۔ اس تار کے بڑے بڑے ڈھول جہازوں میں لاد کر کام شروع کر دیا گیا۔ اس امر کا خاص انتظام کر لیا گیا کہ اگر تار اتفاقیہ کہیں ٹوٹ جائے تو اس کے سرے مشین سے اٹکے رہیں۔ ان انجینیروں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا جو رودبار انگلستان اور بحیرہ روم میں بجلی کے تار بچھا چکے تھے۔

ان احتیاطوں اور پیش بندیوں کے باوجود اگست ۱۸۵۷ء اور جون ۱۸۵۸ء کی تمام کوششیں ناکام رہیں ۱۸۶۵ء میں ایک بہت بڑا جہاز اس غرض سے استعمال کیا گیا۔ اس میں مسافروں کے لیے جو کیبن بنے ہوئے تھے، وہ سب توڑ دیئے گئے، تاکہ تار کے ڈھول رکھنے کی گنجائش نکل آئے۔ دو تہائی تار بچھ چکا تو اچانک ٹوٹ گیا اور اس کا سرا تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔ ۱۸۶۶ء میں تار کا سلسلہ درست ہوا تو ۲۸ جولائی کو مبارک باد کا پہلا پیغام ملکہ وکٹوریا کی طرف سے جمہوریہ امریکہ کے صدر اینڈریو جانسن[3] کو بھیجا گیا۔

نیویارک میں یہ تقریب بڑے جشنوں سے منائی گئی۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ تاریخ کا بہت بڑا واقعہ تھا۔ یورپ سے امریکہ کی علیحدگی قطعی طور پر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی تھی۔

۱- Cyrus W Field ۲- Lord Kelvin ۳- Andrew Johnson

حبشی غلاموں کی آزادی کا اعلان ہوتا ہے

نیو یارک کے اخبار نویس ہوریس گریلے[1] نے پریزیڈنٹ لنکن[2] کے خلاف اپنے اداریتی مقالوں میں پے در پے نہایت تیز اور شدید نکتہ چینی کی تھی۔ لنکن نے ۲۲ر اگست ۱۸۶۲ء کو گریلے کے نام ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ:

> اگر ریاستوں کے اتحاد کو محفوظ رکھنے کا تقاضا یہ ہوتا کہ کسی غلام کو آزاد نہ کیا جائے تو میں یہی راستہ اختیار کر لوں گا۔ اگر اس مقصد کی خاطر سب غلاموں کی آزادی کا اعلان ضروری ہو گیا تو میں اس کے مطابق کاربند ہو جاؤں گا۔ اگر بعض کو آزاد کر دینے اور بعض کو بدستور غلام رکھنے سے اس مقصد کو تقویت پہنچنے کا امکان نظر آیا تو میں یہی طریقہ اپنا لوں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ لنکن پہلے ہی سے آخری طریقے پر کاربند رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے انھیں غلاموں کی آزادی کا اعلان کیا جو اتحاد (یونین) کے خلاف بغاوت میں سرگرم حصّہ لینے والے علاقوں کے اندر مقیم تھے۔ لنکن نے خود یہ حقیقت واضح کر دی کہ میرا اوّلین مقصد باغی ریاستوں کی جنگی مساعی کو کمزور کرنا ہے۔ چنانچہ جزوی آزادی کا اعلان ہو گیا۔ تمام غلاموں کی آزادی کے لیے دستور میں تیرھویں ترمیم کا انتظار کرنا پڑا۔ جزوی اعلان آزادی کے بعد یونین کو اینٹی ایٹم[3] کے مقام پر زبردست فتح حاصل ہوئی، جس سے باہر بڑا اچھا اثر پڑا، ورنہ اندیشہ تھا کہ برطانیہ اور فرانس جنوب کی باغی ریاستوں کی حکومت کو تسلیم کر لیتے اور خانہ جنگی میں یونین کی کامیابی کا راستہ مشکلات سے لبریز ہو جاتا۔

بلاشبہ خانہ جنگی غلامی کے مسئلے پر شروع ہوئی تھی، لیکن لنکن کے نزدیک اس مسئلے کو اتحاد (یونین) کے برابر اہمیت حاصل نہ تھی۔ امریکہ کے بڑے بڑے لیڈروں (مثلاً واشنگٹن[4]، جیفرسن[5]، میڈیسن[6]) کے نزدیک غلامی کو ان جمہوری اصول و مقاصد سے کوئی مناسبت نہ تھی، جن کی خاطر اہل امریکہ نے

۱- Horace Greeley ۲- Abraham Lincoln ۳- Antietan ۴- Washington
۵- Jefferson ۶- Madison

انقلاب کی مصیبتیں برداشت کی تھیں۔ لنکن بھی غلامی کا ویسا ہی مخالف تھا، لیکن جلد بازی میں کوئی قدم اٹھا لینے کی عملی مشکلات سے بھی ناواقف نہ تھا۔ اس کے نزدیک اس مسئلے کا معقول حل یہ تھا کہ مالکوں کو مناسب معاوضہ دے کر غلامی کو تدریجاً ختم کیا جائے۔

انسانوں کی ذلّت خیز تجارت کو روکنے کے لیے پریزیڈنٹ لنکن نے ۱۸۶۳ء میں جو قدم اُٹھایا تھا، بیسویں صدی کے بعض یورپی لیڈروں نے امریکہ سے باہر اس کی ساری برکتوں پر پانی پھیر دیا۔ انجمن اقوام متحدہ نے اس رواج کے متعلق نہایت نفرت انگیز اعداد شائع کیے ہیں جسے نرم الفاظ میں جبری مزدوری کا نام دیا جا رہا ہے۔ انسانوں کی نیلامی کا سلسلہ مدّت ہوئی ختم ہو چکا، لیکن بعض جابر طاقتوں نے فوجی فتوحات کے بعد مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے جو سلوک کیا، اس سے ظاہر ہے کہ اصل مرض وسیع پیمانے پر بدستور موجود ہے اور لنکن نے میسن اور ڈکسن لائن[1] کے جنوب میں رہنے والے مزدوروں کے لیے آزادی کا جو انتظام کر دیا تھا، آج اس کی بھی کوئی صُورت نظر نہیں آتی۔

کیا یہ حقیقت کسی سے مخفی ہے کہ جرمنوں اور اطالویوں نے جو علاقے فتح کیے تھے، ان کے باشندوں کے ساتھ کتنا بُرا سلوک کیا تھا؟ کیا سامراجی طاقتیں آج بھی اسی طریق عمل کی پیروی نہیں کر رہیں؟ یہ بھی تو آخر غلامی ہی کی مختلف صُورتیں ہیں جو انسانوں کے مختلف طبقوں کے لیے مصیبت کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ دُنیا میں حقیقی امن کا انحصار اس امر پر ہے کہ غلامی ہر شکل میں مٹ جائے اور ہر جگہ مکمل جمہوریت قائم ہو جائے۔ پھر پس ماندہ طبقوں کو اس طرح مدد دی جائے جس طرح کسی گھرانے کے زیادہ کمانے والے لوگ اپنے غریب عزیزوں کو مدد دیتے ہیں۔ انجمن اقوام متحدہ اس بارے میں دُنیا کی آخری امید گاہ ہے۔ دیکھیے یہ کب تک اپنے اصل مقصد میں کامیاب ہوتی ہے۔

[1] Mason and Dixon Line
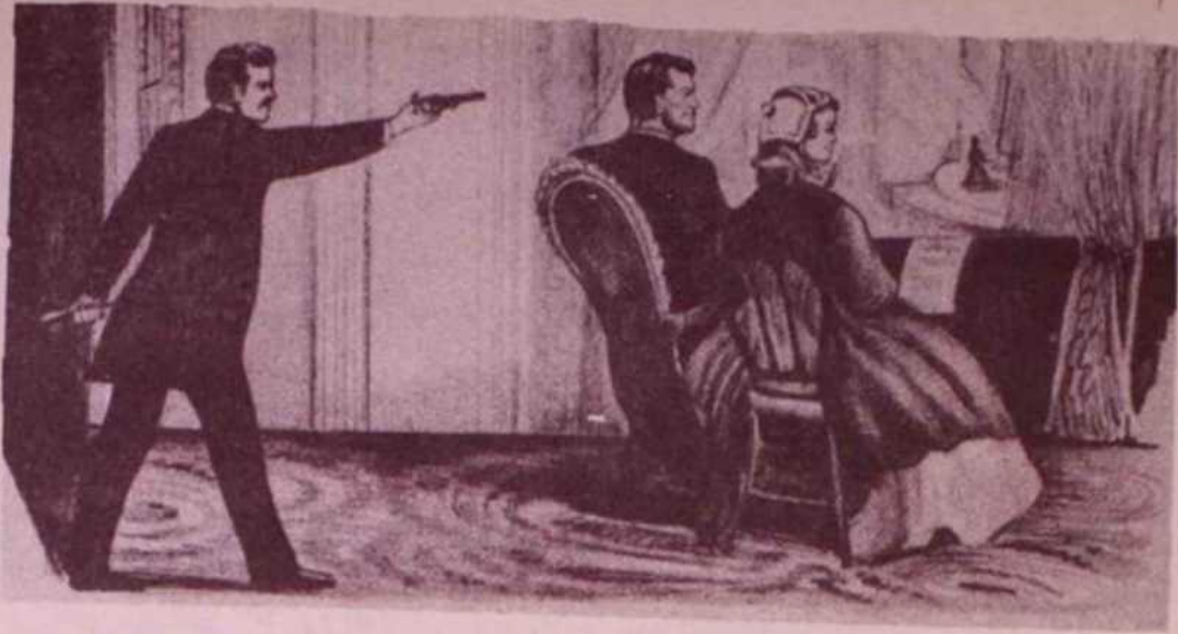
لِنکن قاتل کی گولی کا نشانہ بنتا ہے

امریکہ کی جنوبی ریاستوں کے سپہ سالار جنرل لی[۱] نے بمقام ایپومیٹکس[۲] ہتھیار ڈالے اور امریکہ کی خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا۔ اس سے پانچ روز بعد متحدہ ریاستوں کے فاتح صدر ابراہم لنکن پر ایک ایکٹر نے فورڈ کے تھیٹر (واشنگٹن) میں گولی چلا دی اور اگلے دن صبح کے وقت لنکن نے وفات پائی۔

اس قتل کا نتیجہ یہ نکلا کہ شکست خوردہ جنوبی ریاستوں کی ازسرِ نو تعمیر کا دَور مشکلات سے لبریز ہو گیا۔ تاریخی شخصیت ہونے کے اعتبار سے لنکن کو بقائے دوام کے دفتر میں وہی حیثیت حاصل ہو چکی تھی جو جولیس سیزر کو اپنے عہد میں حاصل ہوئی تھی۔ اہل الرائے اصحاب اس امر پر متفق ہیں کہ سیزر کے قتل نے سیزر کے عہد پر اتنا اثر نہ ڈالا تھا، جتنا لنکن کی موت نے لنکن کے عہد پر ڈالا۔

لنکن کی سادہ مزاجی اور عام مجلسی آداب کی پابندی سے بے پروائی نے امریکیوں کے دل موہ لیے تھے۔ وہ عدالت میں اعلیٰ تعلیم یافتہ قانون دانوں سے بازی لے جاتا تھا۔ کشتیوں میں کسرتی جوانوں کو پچھاڑ دیتا تھا۔ تقریریں اور خطبے لکھتا تو بڑے بڑے زبان آور خطیب اس کے سامنے طفلِ مکتب رہ جاتے۔ سیاسیات کے چکروں میں بھی اس کے مقاصد کی پاکیزگی بدستور قائم رہی اور سخت حوصلہ شکن حالات میں بھی اس نے اپنے بلند نصب العین کبھی ترک نہ کیے۔

اس سے بڑھ کر حوصلہ شکن حالات کیا ہو سکتے تھے کہ ملک دو حصّوں میں بٹا ہوا تباہی خیز خانہ جنگی میں مبتلا تھا اور جو نئی سیاسی پارٹی وجود میں آئی تھی، اس پر قطعاً بھروسا نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس میں حد درجہ انتہا پرست بھی شامل تھے اور وہ قدامت پسند بھی جو مالی مقاصد کے لالچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اپنے فرائض کی انجام دہی میں صدر لنکن کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات ایک لمحے کی فرصت بھی نہ ملتی تھی بایں ہمہ اس نے خانہ جنگی میں فتح و فیروزمندی کا راستہ پیدا کر

۱- General Lee ۲- Appomattox

لیا، لیکن ایک پاگل کی گولی سے محفوظ رہنے کا کوئی سامان اس کے پاس موجود نہ تھا۔ اس کی وفات پر اینڈریو جانسن[1] صدر جمہوریہ بنا۔ لنکن کی طرح جانسن کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ جنوبی ریاستیں اتحاد (یونین) کا لاینفک جزو ہیں اور جن ریاستوں نے علیحدگی کا ارادہ کیا تھا ان کے لیے جمہوریت میں تاریخی مقام پر بحالی کا انتظام زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنا دینا چاہیئے، لیکن ری پبلکن پارٹی کے انتہا پسندوں نے لنکن اور جانسن کے دستور العمل کو ذبح کر کے رکھ دیا۔

جنوبی ریاستوں کے باشندے خود بھی از سرِ نو تعمیر میں مشکلات پیدا کرنے کے ایک حد تک ذمّہ دار تھے۔ لنکن اور جانسن دونوں کی تجویز مصالحت یہ تھی کہ حبشیوں کو جزوی حقِ رائے مل جانا چاہیئے جنوبی ریاستوں نے اس کی بھی مخالفت شروع کر دی۔ اس طرح وہ انتہا پسند ری پبلکن عناصر کے ہاتھ میں آلۂ کار بن گئے۔

شمالی اور جنوبی ریاستوں میں خانہ جنگی جاری تھی کہ گیٹیس برگ کے مقام پر ایک اجتماع ہوا جس میں لنکن نے ہمیشہ یاد رہنے والا خطبہ دیا۔ اس کا ترجمہ ذیل میں درج ہے:

تناسی سال گزر چکے ہیں جب ہمارے اجداد نے اس برِّ اعظم میں ایک نئی قوم کو جنم دیا تھا۔ وہ آزادی کی فضا میں پیدا ہوئی اور اس کا نصب العین یہ تھا کہ تمام انسان بلحاظ پیدائش برابر ہیں۔ اب ہم ایک خوفناک خانہ جنگی میں اُلجھے ہوئے ہیں اور آزمائش ہو رہی ہے کہ آیا یہ قوم، یا ایسے ہی حالات میں جنم لینے والی اور ایسا ہی نصب العین سامنے رکھنے والی کوئی قوم زیادہ دیر تک باقی رہ سکتی ہے؟

ہم اب اس مقام پر جمع ہیں جہاں خانہ جنگی کے دَور کی ایک بہت بڑی لڑائی ہو چکی ہے۔ ہم اس غرض سے آئے ہیں کہ میدانِ کارزار کے ایک حصّے کو ان بہادروں کی آخری آرام گاہ بنا دیں جنھوں نے اس لیے جانیں قربان کیں کہ قوم زندگی اور بقا کی دولت سے بہرہ ور رہے۔ یہ کام یقیناً ہر لحاظ سے موزوں اور مناسب ہے۔ وسیع تر نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس میدان کی تخصیص، تقدیس اور پاکیزگی کا فرض ہم انجام نہیں دے سکتے۔ جو بہادر یہاں لڑے، وہ زندہ ہوں یا مُردہ اس سرزمین کو پاکیزگی کے اس درجے پر پہنچا چکے ہیں کہ ہم بہر کیف نہ اسے بڑھانے کے اہل ہیں اور نہ گھٹانے کے قابل۔ آج جو کچھ ہماری زبان پر جاری ہے، اسے نہ دنیا کوئی اہمیت دے گی اور نہ زیادہ دیر تک یاد رکھے گی، لیکن ان بہادروں کے کارناموں کو کبھی بھلایا نہیں جائے گا۔ ہم زندوں کا فرض یہ ہے کہ اس کام کو پورا کرنے کا حلف اُٹھائیں، جسے انھوں نے لڑ کر کمال شرافت سے تکمیل کے قریب پہنچایا۔ ہمارے لیے یہی زیبا ہے کہ اس کڑے کام کو آخری منزل پر پہنچانے کے لیے اپنی ہر قوّت و طاقت وقف کر دینے کا عہد کریں۔ ان واجب الاحترام مقتولوں سے اس مقصد کے لیے فداکاری کا تازہ جذبہ حاصل کریں جس کے لیے اُنھوں نے فداکاری کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ہمیں پختہ عزم کر لینا چاہیئے کہ ان جوانمردوں نے بے سُود جانیں نہ دی تھیں۔ ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ یہ قوم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آزادی کا نیا جنم لے اور ایسی حکومت رُوئے زمین سے ناپید نہ ہونے پائے جو عوام کی ہے، عوام ہی اُسے چلانے کے ذمّہ دار ہیں اور عوام ہی کی خدمت کے لیے وہ وقف ہے۔

[1] Andrew Johnson

گرہیم بیل ٹیلی فون تیار کرتا ہے

الیگزانڈر گرہیم بیل[۱] نے ۱۸۷۶ء میں ٹیلیفون کی ایجاد مکمل کی جس سے انسانی آواز کو برقی لہروں کی مدد سے کرۂ ارض کے گوشے گوشے میں پہنچانے کا انتظام ہوگیا، لیکن آپ یہ سُن کر یقیناً حیران ہوں گے کہ گرہیم بیل کا اصل مقصد ٹیلیفون ایجاد کرنا نہ تھا، بلکہ وہ اور اس کے والد بہروں اور گونگوں کی تعلیم میں لگے ہوئے تھے۔ گرہیم بیل چاہتا تھا کہ آوازوں کو حرکات میں تبدیل کردے، تاکہ وہ اگر بہروں کے کانوں میں نہیں پہنچ سکتیں تو آنکھوں کے ذریعے سے اُنھیں دکھا کر اصلیت تک پہنچنے کے قابل بنا دیا جائے۔ اس کام سے اس کی دلچسپی برابر قائم رہی۔ چنانچہ جب حکومت فرانس نے ٹیلی فون کی ایجاد پر اُسے پچاس ہزار فرانک کا انعام دیا تو اس نے یہ رقم اس تجربہ گاہ کے حوالے کردی جو بہروں کی سہولت کے لیے نئی نئی تدبیروں کی چھان بین میں لگی ہوئی تھی۔

اس سے پیشتر بھی بہت سے موجد ٹیلی فون کی ایجاد کے لیے کوششیں کرچکے تھے، لیکن کسی کو پوری کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔ گرہیم بیل نے جس اصول پر کام کیا، وہ بہت سادہ اور واضح تھا۔ اس نے سوچا کہ باہر جو آواز پیدا ہوتی ہے، وہ ہوا کی لہروں کے ذریعے سے کان میں پہنچتی ہے اور کان کی جھلّی میں حرکت پیدا کردیتی ہے۔ یہی حرکت دماغ تک چلی جاتی ہے اور انسان اندازہ کرلیتا ہے کہ آواز کیسی ہے یا کیا کہا گیا ہے۔ اگر جھلّی جیسی دو چیزیں لے کر فاصلے پر رکھی جائیں اور انھیں بجلی کے تار کے ذریعے سے ملاکر ایک کی آواز دوسری تک پہنچائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں حرکت پیدا نہ ہو۔ چنانچہ اسی اصول پر کام کرتے ہوئے اُس نے لوہے کی دو پتلی سی پتریاں لیں اور اپنے تجربے میں کامیاب ہوگیا۔ ۱۰ر مارچ ۱۸۷۶ء کو گرہیم بیل نے سب سے پہلا پیغام اپنے رفیق مسٹر واٹسن کو پہنچایا۔ واٹسن سہ منزلہ مکان کے سب سے نچلے کمرے میں مصروف تھا۔ ارد گرد مشینوں کی گڑگڑاہٹ تھی، جس میں کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ عین اس حالت میں گرہیم بیل کی آواز گونجی: "مسٹر واٹسن! یہاں تشریف لائیے، مجھے آپ سے کام ہے۔"

اس کے بعد ٹیلی فون نے آہستہ آہستہ بے اندازہ ترقی کرلی۔

۱- Alexander Graham Bell

تصویریں حرکت کرنے لگتی ہیں

ٹامس آلوا ایڈیسن نے ۶ر اکتوبر ۱۸۸۹ء کو اپنی تجربہ گاہ (واقع نیوجرسی) میں نئی ایجاد کے مظاہرے کا انتظام کیا، جس کا نام "کینیٹو سکوپ" رکھا اور آج دُنیا میں یہ سینما کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اس طرح کی ایک مشین تھی جیسی آج کل بعض لوگ کندھوں پر اُٹھائے پھرتے ہیں اور اسے "سیر بین" کہا جاتا ہے۔ بس جہاں کسی نے چند پیسے دیئے مشین زمین پر رکھی اور چند منٹ کے لیے تصویروں کا تماشا دکھا دیا۔

ایڈیسن نے اس وقت اس ایجاد کو چنداں اہمیت نہ دی۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ بولنے والی جو مشین ایجاد کر چکا ہے، اس کے ساتھ ساتھ تصویریں بھی دکھائی جا سکیں۔ گویا اس نے چالیس سال پیشتر بولنے والی فلموں کا تصور قائم کر لیا تھا۔ دو سال بعد اس نے اپنے بنائے ہوئے کیمرے کو رجسٹرڈ کرایا اور ۱۸۹۴ء میں نیویارک شہر کو پہلے پہل متحرک تصویریں دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

متحرک تصویریں تیار کرنے والے کیمرے کے لیے ایڈیسن نے سلولائڈ کے ایک فیتے پر ایسے مسالے لگائے جو روشنی کا اثر ٹھیک ٹھیک قبول کر سکتے تھے اور اس کا نام "فلم" رکھا۔ تصویروں کے متحرک اور چلتے پھرتے نظر آنے کا راز یہ ہے کہ ہر تصویر سیکنڈ کے ایک حصے کے لیے آنکھ کے پردے پر جمی رہتی ہے۔ پھر بہت ہی قلیل وقفے کے لیے کوئی تصویر سامنے نہیں ہوتی اس کے بعد دُوسری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس طرح پہلی سے دوسری تصویر کا نقش ملتا جاتا ہے اور ایک چلتا پھرتا سلسلہ نظروں کے سامنے قائم ہو جاتا ہے۔

آج کل کی متحرک تصویروں کی فلم ایک چرخی پر لپٹی ہوتی ہے اور ایک جانب کی چرخی سے تیز روشنی میں کھلتی اور دوسری جانب کی چرخی پر لپٹتی جاتی ہے۔ روشنی تصویروں کا سایہ سامنے لٹکے ہوئے سفید پردے پر ڈالتی ہے اور ایک سیکنڈ میں چوبیس مختلف تصویریں سامنے سے گزر جاتی ہیں ہر تصویر کے درمیان ایک وقفہ ہوتا ہے جو ایک سیکنڈ کے ۱/۹۰ یا ۱/۱۰۰ حصے کے برابر سمجھنا چاہیئے۔

ایڈیسن کی ایجاد سے متحرک تصویروں کی صنعت جاری ہوئی۔ اس صنعت نے محض تفریحی مشاغل ہی میں انقلاب پیدا نہیں کیا، بلکہ فلمیں تعلیم کا بھی ایک مؤثر ذریعہ بن گئیں۔

گھوڑے کے بغیر گاڑی چلتی ہے

امریکہ کی ایک ریاست مساچوسیٹس[1] میں سپرنگ فیلڈ[2] نام ایک مقام ہے، وہاں ستمبر ۱۸۹۳ء میں گھوڑے کے بغیر چلنے والی گاڑی کے کامیاب تجربات کیے گئے جس سے گھوڑا گاڑی کا دور ختم ہو گیا اور دنیا میں ایک نئی عظیم الشان صنعت وجود میں آئی۔

پندرھویں صدی ہی میں اس حقیقت کا احساس پیدا ہو گیا تھا کہ میکانکی آلات کے ذریعے سے نقل و حرکت ممکن ہے۔ لیونارڈو دا ونسی[3] ایک مشہور مصور گزرا ہے جس نے مونا لیزا[4] کی شہرہ آفاق تصویر بنائی۔ اس نے بھاپ سے چلنے والی گاڑی کا بھی منصوبہ تیار کیا تھا۔ نکولاس کگنو[5] نے ۱۸۷۰ء میں پہلے تین پہیے کی ایک گاڑی گھوڑے کے بغیر چلائی۔ اگرچہ یہ بہت بھونڈی تھی تاہم جن آٹوموبائل گاڑیوں سے ہم آگاہ ہیں، وہ ایک ایسی ایجاد کے بعد معرض وجود میں آئیں جو انیسویں صدی کے اواخر میں بروئے کار آئی، یعنی داخلی حرارت سے چلنے والا انجن۔

۱۸۹۲ء میں چارلس دوریا[6] نے نئی آٹوموبائل گاڑی کا ڈھانچا اس خیال سے تیار کیا کہ اس کا بھائی فرینک اس کے لیے ایک موزوں انجن تیار کر دے گا۔ ستمبر ۱۸۹۳ء تک فرینک نے نئے انجن کی میکانیکی مشکلات پر قابو پا لیا اور صرف ایک معاملہ باقی رہ گیا کہ اس گاڑی کی رفتار بڑھانے، گھٹانے یا اسے حسب منشا روکنے کا کیا بندوبست ہو۔ فرینک نے پہلی مرتبہ انجن چلایا تو گاڑی قابو میں نہ رہ سکی اور دیوار سے جا ٹکرائی۔ جس شخص نے اس ایجاد میں سرمایہ لگایا تھا، وہ بھی موقع پر موجود تھا۔ گاڑی کا نظارہ کر چکنے کے بعد اسے مزید سرمایہ لگانے میں تامل نہ ہوا۔ غرض دونوں بھائیوں نے آٹوموبائل بنانے کے لیے ایک کمپنی

۱- Massachusetts ۲- Springfield ۳- Leonardo da Vinci ۴- Mona Lisa
۵- Nicolas Cugnot ۶- Charles Durvea

کی بنیاد رکھ دی۔ پھر ہنری فورڈ، چارلس کنگ اور دُوسرے لوگ اس صنعت کی طرف متوجّہ ہوئے اور یہ صنعت اوجِ کمال پر پہنچ گئی۔ آج صرف امریکہ میں پانچ لاکھ سے زیادہ آدمی اس صنعت میں مصروف ہیں اور اس سے متعلّقہ صنعتیں جمہوریۂ امریکہ کی تمام ریاستوں سے خام مال لیتی ہیں۔

ساٹھ باسٹھ سال پیشتر جمہوریۂ امریکہ میں کل تین سو باسٹھ موٹریں تھیں، جن میں سے امریکی ساخت کی موٹریں صرف چار تھیں۔ آج جمہوریہ کے ہر پانچویں فرد کے پاس ایک موٹر ضرور ہے پھر اس ایجاد نے ملک کی زراعت میں بھی زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے اور زرعی فارموں نے کارخانوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

اگر آپ ترقی یافتہ ملکوں خصوصاً امریکہ میں جا کر دیکھیں تو حیران رہ جائیں کہ موٹروں کے ذریعے کس قدر کام کتنی تیزی سے انجام پا رہے ہیں۔ ہر قسم کا سامان ٹرکوں میں لایا جاتا ہے۔ لمبے لمبے سفر لاریوں اور بسوں میں کیے جاتے ہیں۔ بھاری اور مضبوط اور نازک چیزیں ایک جگہ سے دُوسری جگہ پہنچائی جاتی ہیں۔ ٹریکٹر، بل ڈوزر اور خدا جانے کیا کیا چیزیں تیار کر لی گئی ہیں جن کے ذریعے بڑے کٹھن کام حد درجہ آسانی سے اور بہت کم مُدّت میں انجام پاتے ہیں۔ پھر ساتھ ساتھ موٹروں کے سلسلے میں سہولتوں کے انتظامات ایسے کر دیئے گئے ہیں کہ کسی کو تکلیف نہ ہونے پائے۔ مختلف ٹرک مرمّت کا پُورا سامان لیے ہوئے جگہ جگہ چکّر لگاتے رہتے ہیں، تاکہ جہاں کسی کی موٹر میں خلل پیدا ہو، وہاں پہنچ کر اُسے جلد سے جلد درست کر دیں۔

نئی شعاع کا سُراغ ملتا ہے

جرمن پروفیسر وِلہلم کانراڈ روانت جن[1] نے اتفاقیہ ۱۸۹۵ء میں ایکس رے[2] دریافت کر لی اور طبّی دُنیا نے دریافت کی اہمیّت کا اندازہ کرتے ہوئے اس سے کام لینا شروع کر دیا۔ پروفیسر موصوف کے اعلان سے چند روز بعد ایک امریکی ڈاکٹر کے پاس کوئی مریض آیا جس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ ڈاکٹر نے ایکس رے کے ذریعے گولی کی جگہ معلوم کر لی۔ دُنیا کے مختلف حصّوں میں دُوسرے ڈاکٹروں نے ایسے ہی تجربات کیے۔ برطانوی سائنسدان سر ہربرٹ جیکسن نے چھان بین کرتے ہوئے ایک ایسا آلہ تیار کر لیا جو انسانی جسم کے معائنے کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ اسے نمونے کے طور پر سامنے رکھتے ہوئے بعد ازاں زیادہ عمدہ آلے بنائے گئے۔

ایکس رے کی دریافت کا قصّہ بڑا دلچسپ ہے۔ پروفیسر روانت جن شیشے کی ایک نلکی میں سے بجلی کی رَو گزار رہا تھا۔ نلکی کے اوپر سیاہ کاغذ لپٹا ہُوا تھا اور اس میں سے ہوا بالکل نکال دی گئی تھی۔ اگرچہ بجلی کی رَو میں سے روشنی نلکی کے اندر نظر نہ آ سکتی تھی، تاہم پروفیسر نے دیکھا کہ پاس پلاٹینم کے جو ذرّے پڑے ہوئے ہیں وہ خوب چمک رہے ہیں۔ اس نے نلکی اور ذرّوں کے درمیان کئی چیزیں رکھ کر تجربہ کیا۔ روشنی کی لہریں بدستور تمام چیزوں سے گزرتی رہیں حالانکہ عام حالات میں وہ چیزیں روشنی کی لہروں کو روک لیتی ہیں۔

اُسے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ نئی دریافت طب کے لیے خاصی مفید ہو گی، مگر وہ اس کی حقیقت سے بالکل ناواقف تھا، لہٰذا اس کا نام "ایکس رے" رکھا، جو غیر متعیّن اشیاء کو پکارنے کا ایک عام طریقہ ہے۔ بعد ازاں سائنس دانوں نے اسے پروفیسر کے نام سے موسُوم کرنے کی کوشش کی لیکن عام لوگوں کی

۱- Wilhelm Konrad Roentgen ۲- X-ray

زبان پر اس کا نام ایکس رے ہی رہا۔
آگے چل کر سائنس دانوں نے دریافت کر لیا کہ روشنی کی جو لہریں نظر آتی ہیں، ان کے مقابلے میں ایکس رے کی لہریں چھوٹی ہوتی ہیں اور انھیں بجلی یا مقناطیس سے موڑا نہیں جا سکتا۔ انجینیروں نے ایکس رے کی خاص نلکیاں بنالیں جنھیں ضرورت کے مطابق مختلف اشیاء کے اندر کم یا زیادہ گہرائی تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ استعمال ہونے والی لہروں کی مقدار ایک فیصلہ کن عامل بن گئی۔

پھر اسی کے ذریعے سینے اور جسم کے دوسرے حصّوں کی ہڈیوں کی تصویریں لی جانے لگیں، تاکہ دیکھا جا سکے ہڈی کہاں سے ٹوٹی ہے اور اس کی شکست کا کیا حال ہے۔ علاوہ بریں ایکس رے کو جواہرات کے نقائص یا قیمتی تصویروں میں بناوٹ کی دریافت کے لیے استعمال کرنے لگے۔ دھاتوں کے ماہروں کو مختلف قسم کی آمیزشوں کے متعلق ضروری حقائق معلوم ہونے لگے۔

سائنس دانوں نے جو دریافتیں کیں شروع میں اکثر کے فائدے محدود سمجھے گئے، مگر آہستہ آہستہ ان کی قدر و قیمت کا احساس بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ان سے کئی ایسے کام لیے جانے لگے جن کے متعلق شروع میں خیال تک نہ تھا، بالکل یہی کیفیت ایکس رے کی ہے۔ اس سے جو کام آج کل لیے جا رہے ہیں اور یہ مختلف صورتوں میں جتنی مفید ثابت ہو رہی ہے، اس کا صحیح اندازہ ابتداً کسی کو کب تھا اور ابھی کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ کہاں کہاں کیا کیا کام دے گی۔

ریڈیم دریافت ہوتا ہے

پیرس میں پیڑی کیوری[۱] اور اس کی بیوی مادام ماری کیوری[۲] کی تجربہ گاہ ساز و سامانِ تحقیقات کے اعتبار سے بہت معمولی حیثیت رکھتی تھی، تاہم اس میں چھان بین کرتے کرتے انھوں نے ۱۸۹۸ء میں ریڈیم دریافت کر لیا جس نے مرضِ سرطان کے علاج کا ایک مؤثر ذریعہ پیدا کر دیا۔ نیز مادے کی ہیئت ترکیبی کے متعلق ہمیں نئی روشنی مل گئی اور اسی روشنی میں ہم آگے بڑھتے بڑھتے موجودہ دَور پر تک گئے، یہاں تک کہ ذرّے کو توڑنے اور اٹیم کی بے پناہ قوت حاصل کرنے کا راز بھی ہم پر آشکارا ہو گیا۔

دونوں میاں بیوی یورینیم کی گرم تابی اور شعاع زنی[۳] کے متعلق تحقیقات میں لگے ہوئے تھے۔ اچانک انھیں محسوس ہوا کہ ان کے برق نما[۴] میں روشنی کی ایسی لہریں پیدا ہو رہی ہیں جن کا کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا۔ خوب غور اور چھان بین کے بعد ان پر آشکارا ہوا کہ خام یورینیم کی گرم تابی و شعاع زنی یورینیم کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ وہ تحلیل و تجزیے میں لگے رہے اور آہستہ آہستہ شعاع زن اجزا کو الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آخر انھیں دو نئے عنصر نہایت قلیل مقدار میں مل گئے۔ ایک کا نام انھوں نے ریڈیم رکھا اور دوسرے کا بیریم۔ ان دونوں کی گرم تابی اور شعاع زنی بہت اعلیٰ پیمانے پر پہنچی ہوئی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں مادام کیوری نے محنت و مشقت سے خالص ریڈیم کو الگ کر لیا۔

طبیعیات کا اصول تحفظِ قوّت ہے، لیکن ریڈیم سے متواتر حرارت اور روشنی نکلتے رہنے کی بنا پر شروع میں خیال ہوا کہ مذکورہ بالا اصول غلط ثابت ہو رہا ہے، آخر سائنس دان غور کرتے کرتے اس نتیجے پر پہنچے کہ عنصر پر برابر تحلیل کا عمل جاری ہے۔ ہر ذرّہ اپنی قوّت باہر پھینکتے پھینکتے جو حصّہ الگ کرتا ہے، وہ ایک اور عنصر کی شکل میں

۱- Pierre Curie ۲- Marie Curie ۳- Radioactivity ۴- Electroscope

تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا نام پولونیم تجویز ہوا۔
ریڈیم کے تحلیل ہونے سے جو روشنی کی تین شعاعیں پیدا ہوتی ہیں ان کے نام الف، ب اور ج رکھے گئے۔ الف شعاع اور شعاع ب دراصل نہایت باریک ذرّے ہیں اور ج روشنی کی عام شعاعوں جیسی شعاع ہے۔ اسے گھڑیوں کے ڈائلوں میں ہندسوں کو روشن کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ الف شعاع کے ذرّات ہیلیم سے مرکّب ہیں اور ان کا چارج مثبت ہے۔ اس کے برعکس ب شعاع کے اجزا برق پارے ہیں جن کا چارج منفی ہے۔ الف شعاع اور ب شعاع ہی کو طبابت میں جسم انسانی کے ان فاسد پھوڑوں پر استعمال کیا جاتا ہے جن کی جڑیں بہت گہری ہوں۔
پیئری کیوری اور ماری کیوری کے انکشاف کو مادے کے ذرّات کی تحقیقات میں جو اہمیّت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ ایٹم بم کے لیے چھان بین کرتے کرتے جو نیا عنصر سامنے آیا، اس کا نام مذکورہ بالا سائنس دانوں کے نام پر "کیوریم" رکھا گیا۔
سر آغا خاں نے اپنے سوانح حیات میں ریڈیم کے متعلّق ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ ایران کا بادشاہ مظفر الدّین یورپ گیا تو قیام پیرس کے زمانے میں اس نے ریڈیم دیکھنے کی بھی خواہش کی۔ سر آغا خاں نے اپنے اثر سے کام لے کر پیئری کیوری اور ماری کیوری کو ریڈیم دکھانے پر راضی کیا۔ جہاں مظفر الدّین شاہ ٹھہرا ہوا تھا اس کی نچلی منزل میں سیاہ پردے تان کر اندھیرا کر لیا گیا۔ جب بادشاہ اور اس کے مصاحب کُرسیوں پر بیٹھ گئے تو بتّیاں گُل کر دی گئیں اور ریڈیم سامنے میز پر رکھ دیا گیا۔
ریڈیم کی چمک دمک دیکھ کر بادشاہ پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ چیخنے لگا اور بولا یہ مجھے قتل کرنے کی تدبیر ہے۔ دونوں سائنس دان اس پر بہت رنجیدہ ہُوئے۔ بعد میں بادشاہ نے ان کے لیے خاص سنہری تمغے بنوائے لیکن انھوں نے قبول نہ کیے۔

مارکونی بے تار پیغامات بھیجتا ہے

مارکونی کی عمر ستائیس سال کی تھی جب اُس نے ۱۹۰۱ء میں لاسلکی پیغامات یورپ سے امریکہ بھیجنے کا پہلا کامیاب تجربہ کیا۔ اس نے ایک مرکز کارنوال (انگلستان) میں بنایا اور دُوسرا سینٹ جان (نیو فونڈ لینڈ امریکہ) میں۔ کارنوال سے بجلی کے ذریعے جو اشارے بھیجے گئے وہ سینٹ جان میں پہنچ گئے حالانکہ بیچ میں تار کا کوئی سلسلہ موجود نہ تھا اور تین ہزار میل چوڑا سمندر بھی رکاوٹ نہ بن سکا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ کرۂ ارض کا خم بجلی کی لہروں کو روک نہیں سکتا اور تار کے بغیر دُنیا کے ہر حصّے میں پیغام رسانی کا سلسلہ جاری کر دینا ایک مثبت حقیقت بن گیا۔

گگلی ایلمو مارکونی[1] دولت مند والدین کا بیٹا تھا۔ اس کی تعلیم کا انتظام زیادہ تر گھر پر ہُوا۔ برقیات سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ ہینرچ ہرٹز[2] نے بجلی اور مقناطیس کی لہریں دریافت کر لیں تو یہ دریافت مارکونی کے سمندِ شوق کے لیے تازیانہ بن گئی۔ اس نے تجربات کے بعد نیا آلہ تیار کر لیا جو پہلے سائنس دانوں کے آلوں سے بہتر تھا۔ بائیس سال کی عمر میں اس نے ایک ایسی مشین ایجاد کر لی، جس کے ذریعے بغیر تار کے دو میل کے فاصلے پر پیغامات بھیجے جا سکتے تھے۔ اس کے اہلِ وطن نے اس ایجاد کی کوئی قدر نہ کی، لہٰذا وہ انگلستان چلا گیا، جہاں اسے قدر دان انجینیروں کے مل جانے کی اُمید تھی۔ وہاں اسے صرف روپیہ ہی نہ ملا، سائنس دانوں کی تائید و حمایت بھی حاصل ہو گئی اور اپنی ایجاد کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کا موقع مل گیا۔

مارکونی کے سامنے کلارک میکسویل[3] اور ہینرچ ہرٹز[2] کی نظری تحقیقات موجود تھی جس میں ریڈیائی لہروں کی حقیقی حیثیت واضح کی گئی تھی۔ مارکونی نے اس نظری تحقیقات کو عملیات کی سطح

۱- Guglielmo Marconi. ۲- Heinrich Hertz ۳- Clerk Maxwell

پر پہنچادیا۔ اس کی ایک خوش نصیبی یہ تھی کہ جب سے اس نے اپنی تحقیقات کو برقی خبر رسانی کے لیے استعمال کیا، اس تحقیقات کو نامور سائنس دانوں، انجینیروں، منتظموں اور ماہرین فنون لطیفہ کے ہاتھوں سے گزرنے کا موقع ملا۔ اس طرح وہ ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہوگئی، نیز وہ اطلاعات، تفریح اور اشتہار کے علاوہ نفسیاتی جنگ میں بھی ایک زبردست حربہ بن گئی۔ مادی جنگ میں بھی وہ حد درجے قیمتی ہتھیار ہے۔ موجودہ دور کے وسیع لشکروں میں سب سے بڑھ کر اہم اور ضروری چیز یہ ہے، کہ اطلاعات جلد سے جلد ہر جگہ پہنچائی جاسکیں اور ظاہر ہے کہ فوجوں کے مختلف حصے ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوتے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر حصے کی خبریں سپہ سالار کو وقت پر ملتی رہیں تاکہ وہ ایک حصے کی کیفیت پیش نظر رکھ کر دوسرے حصوں کو مناسب حکم دے سکے۔

ان اطلاعات کے لیے ریڈیو سے بہتر ذریعہ کونسا ہے! پھر ادھر خبر نشر ہوئی اُدھر جہاں اسے پہنچانا مقصود ہے پہنچ گئی۔ اس میں ایک دقّت تھی اور وہ یہ کہ دشمن کے لیے بھی ان خبروں سے فائدہ اُٹھا لینے کے امکانات موجود تھے۔ اس کا علاج یہی تھا کہ ایسی تمام خبریں رمز و کنایے کی شکل میں نشر کی جاتیں، تاکہ اپنوں کے سوا کوئی انھیں سمجھ نہ سکتا، یہی کیا گیا۔ تار کے بغیر اور صرف برقی لہروں کے ذریعے پیغامات بھیجنے کے بے شمار فائدوں کا اندازہ کیجیے۔ اکتشافات کی مہمیں دُور دُور بھیجی جاتی ہیں۔ ریڈیو کے ذریعے ان کے ساتھ برابر تعلق قائم رکھا جاسکتا ہے۔ اکا دُکا جہاز سمندر کی وسعت میں کہیں مبتلائے مصیبت ہوجائے یا اُسے کوئی حادثہ پیش آجائے تو دُور دُور تک فوراً اطّلاع پہنچائی جاسکتی ہے اور جگہ جگہ سے امدادی پارٹیاں موقع پر پہنچ سکتی ہیں۔

پہلا ہوائی جہاز اُڑتا ہے

اب انسان چاند میں پہنچنے کے لیے سعی و کوشش کر رہا ہے اور فضائے محیط میں سے پرواز کرتے ہوئے چاند پر پہنچ جانا سائنس دانوں کے لیے اب ایسا مسئلہ نہیں رہا کہ اس کے امکان پر گفتگو کی جائے، بلکہ اب یہ اندازہ کیا جا رہا ہے کہ اس مہم پر کتنا خرچ ہوگا۔ اب ولبر رائٹ اور آرویل رائٹ کسے یاد ہیں، جنھوں نے سب سے پہلے امریکہ میں پرواز کی تھی۔

جب ان بھائیوں نے فضائے آسمانی میں پرواز سے دلچسپی کا اظہار کیا تو صُورتِ حال ایسی تھی کہ لوگ زمین سے اُوپر اُٹھنے کے امکانات کو چنداں وقعت نہ دیتے تھے۔ ولبر اور آرویل نے بہت جلد معلوم کر لیا کہ ہوائی حرکیات کے بارے میں جتنے نظریات موجود ہیں، ان میں سے بیشتر اصل مقصد سے ہٹے ہُوئے ہیں۔ انھوں نے خود ہوا کا ایک نل بنایا جس میں پرواز کے متعلق خود ہی تجربات کرتے رہے۔ وہ دونوں غیر شادی شدہ تھے۔ دن بھر سائیکل کی دُکان میں کام کرتے، گھر واپس آ کر اپنا سارا وقت تجربات میں گزار دیتے۔

آخر انھوں نے کنٹرول کا ایک ایسا نظام دریافت کر لیا جس کے ذریعے سے ہوا کا دباؤ مشین کے مختلف حصّوں پر بدلتا رہتا تھا اور اسے رجسٹر کرا لیا۔ ہوا کے نل میں جو تجربات کرتے رہے تھے، ان کی بنا پر اُنھوں نے قبل از وقت اعلان کر دیا کہ ہم ہوا میں پرواز کا مظاہرہ کریں گے۔ چنانچہ ایک ایسا جہاز تیار کر لیا جس میں ابتدائی تجویز کے خلاف ایک چوتھائی سے نصف تک قوت صرف ہوتی تھی۔ ان کا جہاز چار سلنڈر کا تھا۔ اس میں بارہ گھوڑوں کی طاقت کا انجن لگایا، جو پٹرول سے چلتا تھا۔ ایک مسافر کے وزن کو شامل کرتے ہوئے جہاز کا کل وزن ساڑھے سات سو پونڈ تھا۔ دسمبر ۱۹۰۳ء میں یہ جہاز کٹی ہاک پہنچا۔ ۱۷ دسمبر کو آرویل نے اس میں چار مرتبہ پرواز کی۔ جہاز قریباً ایک منٹ ہوا میں رہا اور صرف تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے پرواز کر سکا۔ آج کل ہوائی جہاز ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔

پیئری قطب شمالی پر پہنچتا ہے

۶؍اپریل ۱۹۰۹ء کو کمانڈر رابرٹ ایڈون پیئری[1] قطب شمالی پر پہنچ گیا۔ کرۂ ارض کے انتہائی شمالی حصّے کا یہ مرکزی نقطہ ہے جسے ہماری دُنیا کا بلند ترین مقام سمجھا جاتا ہے۔ پانچ اور آدمی پیئری کے ہمراہ تھے۔ وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرے۔ خوب چھان بین کر لی کہ آیا وہ واقعی عرض البلد کے ۹۰ درجے پر پہنچ گئے ہیں۔ آس پاس کے سمندر کی گہرائی کا اندازہ کیا۔ پھر اپنے جہاز پر لوٹ آئے جس کا نام "روز ویلٹ" تھا اور وہ قطب شمالی کے سفر کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہُوئے بنایا گیا تھا۔ پُورے سفر میں صرف ایک جان تلف ہوئی۔

اس مہم کو سر کرنا آسان نہ تھا اور نہ یہ ایک جست میں سر ہوئی۔ خود پیئری نے اس سلسلے میں چار مرتبہ کوششیں کیں اور آخری کوشش میں کامیابی کا سہرا اس کے سر بندھا۔ وہ پہلی مرتبہ ۱۸۹۲ء میں گیا۔ اس سفر میں بیوی کو بھی ساتھ لے گیا لیکن ۸۳ عرض البلد سے ذرا آگے بڑھ کر اسے لوٹنا پڑا۔ ۱۹۰۲ء میں اس نے پھر کمر ہمت باندھی اور اپنے ایک حبشی رفیق ہن سن کی معیت میں تھوڑا سا اور آگے بڑھا۔

اس کی جانفشانی اور بلند ہمتی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک خاص جہاز اس کے لیے تیار کر دیا گیا۔ یہ جہاز قطب شمالی کے سمندر میں سفر کے لیے بہت موزوں تھا، جہاں برف کے تودے چکّر لگاتے رہتے ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں پیئری اس جہاز پر روانہ ہُوا۔ دو سال کا سامانِ رسد ساتھ لے لیا تھا۔ سخت سردی کا موسم گرین لینڈ میں گزارنے کے بعد پیئری اور اس کے ساتھی ۲۱؍فروری ۱۹۰۶ء کو برف گاڑیوں میں روانہ ہُوئے جن میں پہیے نہیں ہوتے اور کتّے ان گاڑیوں کو برف پر کھینچتے ہیں، لیکن ۸۴ عرض البلد اور ۸۵ عرض البلد کے درمیان انھیں رُکنا پڑا، اس لیے کہ پانی آ گیا تھا جس پر برف گاڑیاں کام نہ دے سکتی تھیں۔ پھر ایک طوفان آیا جو چھ دن برابر جاری رہا۔ اس میں خبر رسانی کے سلسلے کٹ گئے اور رسد کے جو مرکز جگہ جگہ قائم کیے گئے تھے، وہ برباد ہو گئے۔ ناچار ۲۱؍اپریل ۱۹۰۶ء کو انھیں واپس ہونا

[1] Robert Edwin Peary -۱

پڑا۔ حالانکہ وہ ۸۷ عرض البلد سے بھی کسی قدر آگے بڑھ چکے تھے اور منزلِ مقصود نزدیک معلوم ہوتی تھی۔ واپسی کے سفر میں بھی انہیں بہت تکلیفیں پیش آئیں۔

۱۹۰۸ء میں پیئری نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب کے قطب شمالی پر پہنچے بغیر نہ لوٹے گا۔ چنانچہ وہ ۲۱ اگست کو روانہ ہوا۔ اس مرتبہ بھی سردی کا موسم گرین لینڈ میں گزارا۔ پھر چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنالیں۔ ہر ٹولی تھوڑے تھوڑے وقفے سے روانہ ہوئی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اگلی ٹولی بعد میں آنے والوں کے لیے راستہ بناتی جاتی اور جب وہ لوگ دیکھتے کہ رسد کم ہو رہی ہے تو ان ساتھیوں کو واپس کر دیتے جو بیمار یا کمزور ہوتے۔ منزل کا آخری حصّہ صرف پیئری ہن سن اور ان کے چار ساتھیوں نے طے کیا۔ ان کے جوش اور بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ قطب شمالی سے دوسری سمت میں ایک میل کا فاصلہ طے کر گئے۔ بہر حال وہ ڈیڑھ دن قطب شمالی میں ٹھہرے رہے۔

ان کی مشکلات کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ اس سفر میں بعض مقامات پر درجۂ حرارت ۷۲ سے بھی نیچے تھا۔

۱۹۱۱ء میں پیئری کو نائب امیر البحر کا لقب دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے وفات پائی۔ پھر ہوائی جہازوں کی دوڑ شروع ہو گئی۔ ۱۹۲۶ء میں امریکہ کے امیر البحر رچرڈ برڈ[1] کا ہوائی جہاز سب سے پہلے قطب شمالی کے مرکزی نقطے پر پہنچا۔ شروع میں قطب شمالی تک پہنچنے کے لیے برف، قلّتِ خوراک، بے آبادی اور فاصلے کی مشکلات حائل تھیں۔ اب وہ مشکلات ایک حد تک ختم ہو گئی ہیں اور فوجوں کی نقل و حرکت کے لیے ضروری معلومات بہم پہنچانے کا زیادہ خطرناک مسئلہ سامنے آگیا ہے۔ اب یہ اندازہ کیا جا رہا ہے کہ جنگی جہازوں کو مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق کی طرف لانے لے جانے میں کیا کیا مرحلے پیش آ سکتے ہیں۔ قطب شمالی کے موسم کے متعلق بھی قیمتی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

۱- Richard Byrd

نہر پاناما کا افتتاح ہوتا ہے

نہر پاناما دُنیا کی ایک بہت بڑی آبی شاہراہ ہے، جسے جمہوریۂ امریکہ نے خاکنائے پاناما کو کاٹ کر تیار کیا تھا۔ اس نہر نے اطلانطک کو بحرالکاہل سے ملا دیا ہے۔ اگرچہ جہاز اس میں سے پہلے ہی گزرنے لگے تھے، لیکن اس کے افتتاح کی رسم سرکاری طور پر تھیوڈور روزویلٹ صدر جمہوریۂ امریکہ نے ۱۲ر جولائی ۱۹۱۵ء کو ادا کی۔ دُنیا میں اسے انجینیئری کے عجائبات کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔

اس نہر کی کھُدائی ۱۹۰۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۴ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس کے لیے ریاست پاناما سے دائمی پٹے پر زمین لے لی گئی تھی۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ نہر بنانے کا خیال پہلے پہل جمہوریہ امریکہ کو آیا، بلکہ جس زمانے میں ہسپانیہ کی سلطنت عروج پر تھی اور نئی دُنیا میں اس کی آبادکاری کا ڈنکا بج رہا تھا، اس زمانے میں بھی یہاں سے ایک نہر بنانے کی تجویز زیرِ غور آئی تھی۔ اس وقت تک جمہوریۂ امریکہ وجود ہی میں نہ آئی تھی۔ جب امریکی ریاستوں نے آزادی حاصل کر لی تو انھیں یہ احساس ہُوا کہ اگر پاناما میں سے ایک نہر بنا دی جائے، جس سے جہاز بآسانی گزر سکیں تو اطلانطک سے بحرالکاہل میں جانے کے لیے جہازوں کو جنوبی امریکہ کا چکّر نہ لگانا پڑے گا۔ اس طرح وقت بھی بچ جائے گا، خرچ میں بھی کفایت رہے گی اور تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ عین اسی زمانے میں برطانیہ اور فرانس بھی اس نہر کی تعمیر سے دِلچسپی لینے لگے۔ جمہوریہ امریکہ نے پہلے برطانیہ سے معاہدہ کر کے نہر بنانے کے پُورے حقوق حاصل کر لیے۔ پھر فرانس کی کوششیں ناکام ہوئیں اور اس کی دو بڑی تجارتی کمپنیوں کا دیوالہ نکل گیا تو اس نے بھی دست برداری اختیار کر لی اور جمہوریہ امریکہ تنہا میدان میں رہ گئی۔

نہر کی تعمیر پر کل تینتیس کروڑ چھیاسٹھ لاکھ

پچاس ہزار ڈالر خرچ ہُوئے اور تقریباً چوبیس کروڑ مکعب گز زمین کھودی گئی۔ نہر کا رُخ شرقی غربی نہیں، بلکہ اطلانٹک کی جانب سے کولون کو مرکز قرار دیں تو بحر الکاہل کے ساحل پر بلبوآ تک اس کا رُخ جنوبی اور جنوب مشرقی ہے۔ اگر ایک سمندر کے ساحل سے دُوسرے سمندر کے ساحل تک فاصلہ ناپا جائے تو اصل نہر قریباً چالیس میل لمبی ہے، لیکن اطرافِ نہر میں دو نو طرف سمندروں میں بھی کسی قدر زمین کھود کر جہازوں کی آمد و رفت کے قابل بنانی پڑی تھی۔ اسے بھی حساب میں شامل کر لیا جائے تو نہر کی لمبائی پونے اکیاون میل بن جاتی ہے۔ اس کی کم سے کم گہرائی اکتالیس فٹ ہے۔

انجینیئری کا خاص کمال نہر کھودنے میں نہیں، بلکہ اس کے اندر بند بنانے میں صرف کیا گیا ہے۔ مثلاً جو جہاز اوقیانوس کی طرف سے نہر میں داخل ہو، اسے بندوں کے پہلے سلسلے میں سطح بحر سے پچاسی فٹ کی بلندی پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ پھر جہاز ایک اور بند سے گزرتا ہُوا بحر الکاہل کی جانب بندوں کے آخری سلسلے میں عام سطح پر آجاتا ہے اور بے تکلف دُوسرے سمندر میں داخل ہو جاتا ہے۔ پُورا فاصلہ طے کرنے میں سات آٹھ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔

اگر یہ نہر نہ بنتی اور وسط امریکہ میں سے جہازوں کے لیے آمد و رفت کا انتظام نہ کیا جاتا، تو اندازہ کیجیے کہ کتنی مشقت اُٹھانی پڑتی، کتنا وقت اور روپیہ صرف ہوتا! فرض کیجیے کہ جہاز کو وسط امریکہ کی کسی مشرقی بندرگاہ سے مغربی بندرگاہ میں جانا ہوتا تو وہ پُورے جنوبی امریکہ کا چکّر لگائے بغیر نہ جا سکتا اور یہ فاصلہ کم از کم دس ہزار میل ہوتا۔ اب نہر پاناما میں سے صرف اکاون میل کا فاصلہ طے کر کے جہاز مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف آجا سکتا ہے۔

Balboa -۲ Colon -۱

جنگ کی پہلی چنگاری چھوٹتی ہے

۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ کا آغاز آسٹریا ہنگری کے ولی عہد فرانسس فرڈی نینڈ کے قتل سے ہُوا۔ یہ واقعہ ۲۸ ؍جون کو پیش آیا۔ ۳؍اگست کو جرمنی نے بلجیم اور لکسمبرگ پر حملہ کر دیا۔ اس طرح جنگ شروع ہو گئی۔ بعض مؤرخوں کی رائے ہے کہ تھوڑا سا وقت اور نکل جاتا تو ممکن تھا جنگ بالکل نہ ہوتی یا اس کا دائرہ محدود رہتا۔ گویا دل سے جنگ کا خواہاں شاید کوئی بھی نہ تھا، مگر فوجوں کی نقل و حرکت کے احکام جاری ہو چکے تھے۔ یکایک ٹکر ہو گئی، جس طرح کوئی آتش فشاں پھٹتا ہے تو ہر طرف تباہ کن لاوا بہہ نکلتا ہے۔

بہ حیثیت مجموعی اس جنگ کو اک گونہ قتل عام سمجھنا چاہیئے۔ فوجی تنظیمات ناقص، منصوبہ بندی کمزور اور ناقابل توجہ، نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ جنگ میں حصہ لینے والے حد درجہ تکلیفیں اور مصیبتیں اُٹھاتے۔ نقصانات کا اندازہ یہ ہے کہ کم و بیش ایک کروڑ آدمی مارے گئے، دو کروڑ کے قریب زخمی ہوئے جو جائدادیں تباہ ہوئیں ان کی قیمت کا حساب لگانا مشکل ہے۔

جرمنوں کو دریائے مارن[۱] کی پہلی جنگ میں فیصلہ کُن اقدام کا موقع مل گیا تھا اور پیرس ان کے رحم و کرم پر تھا، مگر معلوم نہیں کیوں وہ یکایک پیچھے ہٹے اور خندقیں کھود کر ان میں بیٹھ گئے۔ بعد کے تین سال انھی خندقوں میں گزار دیئے۔ بے شک مشرقی محاذ پر ہنڈنبرگ کے زیرِ قیادت انھوں نے روسیوں کو لرزہ خیز شکستیں دیں۔ ۱۹۱۶ء میں رُوسیوں نے جوابی حملہ کیا، مگر دس لاکھ رُوسی کھیت رہے۔ اس خوفناک حادثے سے رُوس میں انقلاب رونما ہُوا اور اس نے جنگ سے دست کشی اختیار کر لی۔ آسٹریا جرمنی اور بلغاریہ کی امداد کے بغیر سرویا اور مانٹی نیگرو کے خلاف بھی کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ برطانیہ نے جرمنوں کی افریقی نو آبادیوں پر قبضہ جما لیا، لیکن گیلی پولی میں ترکوں سے شکست کھائی۔ اٹلی، جرمنی اور آسٹریا سے معاہدے کے خلاف برطانیہ اور

۱- Marne

فرانس کے ساتھ مل گیا۔ ۱۹۱۷ء تک آسٹریا سے بے نتیجہ لڑتا رہا۔ کیپورٹیو[۱] میں اس کا بُھرکس نکل گیا۔

اس جنگ میں سائنس کے کمالات بھی خوب نمایاں ہوئے۔ جرمنوں نے آبدوزوں کے حملے اس پیمانے پر پہنچا دیئے کہ بحری تجارت کے لیے دہشت انگیز خطرہ پیدا ہو گیا، بلکہ برطانیہ کی بحری برتری کا شیرازہ درہم برہم ہونے کے قریب پہنچ گیا تھا، لیکن جرمنوں سے یہ غلطی بھی ہوئی کہ امریکی جہاز لوسی ٹینیا[۲] کو انھوں نے ڈبو دیا جس پر ۱۹۱۷ء میں امریکہ بھی فرانس و برطانیہ کے دوش بدوش لڑائی میں شریک ہو گیا۔ برطانیہ اگرچہ زہریلی گیس ایجاد کر چکا تھا، لیکن ہمدردی بنی نوع کے خیال سے اس نے اسے استعمال نہ کیا۔ جرمنی نے اس حربے سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے ٹینک بنائے، اگرچہ ان سے مؤثر طریق پر کام نہ لیا گیا۔ جرمنوں نے دُوسری عالمگیر جنگ میں ٹینکوں سے جو فائدہ اُٹھایا وہ سب پر آشکارا ہے۔ ہوائی جہاز بھی اس جنگ میں ایک عامل بن گئے، اگرچہ ان سے زیادہ تر دیکھ بھال یا بمباری کا کام لیا گیا۔ جرمنوں نے جو بڑی توپ ایجاد کی تھی، وہ چالیس میل سے پیرس پر گولے برساتی رہی، لیکن جن چیزوں کو فوجی اغراض کے لیے استعمال کیا گیا ان میں سب سے بڑھ کر قابل ذکر ٹرک اور موٹریں تھیں۔ ان سے جنگی نقل و حرکت کے نئے دَور کا آغاز ہُوا۔

امریکی فوجیں اگرچہ بڑی بہادری سے لڑیں، لیکن برطانیہ اور فرانس کے مقابلے میں ان کا درجہ نسبتہً کم تھا۔ ۱۹۱۸ء میں جرمن آبدوزوں کا خطرہ کم ہو گیا تو چھ لاکھ امریکی فوجیں فرانس پہنچ گئیں۔ جرمنوں میں داخلی اختلافات شروع ہو گئے۔ ستمبر، اکتوبر اور نومبر میں وہ ہر محاذ پر پسپا ہوئے۔ جرمن بیڑے کے لیے آخری جد و جہد کا جو منصوبہ تیار کیا گیا تھا، اس پر عمل کا وقت آیا تو ۲۹ر اکتوبر کو بغاوت شروع ہو گئی۔ اگلے مہینے متارکہ ہُوا تو جس بیڑے پر جرمنوں کو ناز تھا وہ اتّحادیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ اس میں دس جنگی جہاز تھے۔ چھ جنگی کروزر، آٹھ ہلکے کروزر، پچاس تباہ کُن جہاز اور تمام آبدوزیں۔

۱- Caporetto ۲- Lusitania

روس میں انقلاب برپا ہوتا ہے

۷ر نومبر ۱۹۱۷ء کو بالشویک لینن کی قیادت میں اُٹھے اور حکومت پر قبضہ کر کے اس طاقت ور رُوس کا سنگِ بُنیاد رکھا جس کے بارے میں آج دُنیا کو گُوناگوں شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس وقت بالشویکوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور انھیں خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔ لینن بھی جلاوطن تھا۔

طوفانی دَور کے اس انقلابی واقع کا مرکز زیادہ تر وہ شہر تھا جسے روس میں دُوسرا درجہ حاصل تھا۔ اس کا نام ۱۹۱۴ء تک سینٹ پیٹرز برگ تھا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۴ء تک پیٹرو گراڈ رہا۔ لینن کی وفات پر اسے لینن گراڈ کا نام دیا گیا۔ اس شہر کی بنیاد ۱۷۰۳ء میں اس زار نے رکھی تھی جو تاریخ میں پیٹر اعظم کے نام سے مشہور ہے۔ اسے مغربی یورپ کے انداز میں تعمیر کیا گیا۔ پیٹر کے نزدیک یہ ایک کھڑکی تھی جو یورپ پر کھلتی تھی۔ آج بھی اکثر لوگ ایک حد تک خوف زدگی کے عالم میں یہی رائے رکھتے ہیں۔

یہ شہر رُوس میں فنون و صنائع کا مرکز بن گیا۔ سامانِ جنگ کا عظیم الشّان کارخانہ بھی یہیں تھا۔ آج اس کی آبادی ۳۰ لاکھ سے زیادہ ہے۔ ۱۹۰۵ء میں سینٹ پیٹرز برگ کے مزدوروں نے زار کے سامنے ایک درخواست پیش کرنی چاہی تھی جس پر انقلاب شروع ہو گیا۔ پیٹرو گراڈ کے مزدوروں، سپاہیوں اور ملاحوں نے ۱۹۱۷ء کا انقلاب بپا کر دیا۔ گویا اس شہر میں تاریخ دُہرائی جاتی رہی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ پھر نہ دُہرائی جائے گی۔

بالشویزم اور سوویٹ رُوس کا بانی لینن نہ اس شہر میں پیدا ہُوا تھا اور نہ اس کا اصل نام لینن تھا۔ اس کی ولادت سن برسک[1] میں ہوئی، جسے آج کل لینن کے اعزاز میں الیانوسک[2] کہتے ہیں؛ اس لیے کہ لینن کا اصل نام ولادیمیر الیچ الیانوسک[3] تھا۔ وہ ایک معلّم کا بیٹا تھا۔ ابتدا ہی سے اسے انقلابی خیالات سے ہمدردی تھی۔ اس کے بھائی نے زار الیگزانڈر سوم کے خلاف سازش میں حصّہ لیا اور موت کی سزا پائی۔ غالباً اس وقت سے انقلاب

۱- Sinbirsk ۲- Ulyanovsk ۳- Vladimir Ilyich Ulyanovsk

لینن کی زندگی کا واحد نصب العین بن گیا۔

وہ قانون کی تعلیم پا رہا تھا، لیکن انقلابی سرگرمیوں کے باعث جلاوطن ہونا پڑا۔ سائبیریا بھی بھیجا گیا۔ پھر وہ رُوس کے باہر مختلف ملکوں میں انقلابی کام کرتا رہا۔ ۱۹۰۳ء میں لندن گیا، جہاں روس کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی (حزب جمہوریہ اشتراکیہ) کا اجلاس ہوا اور یہ پارٹی دو حصّوں میں بٹ گئی۔ ایک کا نام بالشویک رکھا گیا، دُوسری کا منشویک۔ بالشویکوں کی قیادت لینن نے سنبھال لی۔ ۱۹۰۵ء میں ہنگامہ بپا ہوا تو لینن نے رُوس پہنچ کر دوسرے بالشویک لیڈروں کو اپنا ہم نوا بنا لیا، لیکن پھر اسے وطن چھوڑنا پڑا۔ پہلی جنگ یورپ کے وقت وہ سوئٹزرلینڈ میں مقیم تھا۔

فروری ۱۹۱۷ء میں انقلاب بپا ہوا تو جرمنوں نے اُسے اجازت دے دی کہ بند گاڑی میں جرمنی سے گزرتا ہوا رُوس پہنچ جائے۔ وہاں ایک اعتدال پسند امیر نے نئی حکومت بنالی تھی، تاکہ مزدور اور سپاہی جنگی مساعی کے سلسلے میں بدستور اپنا فرض انجام دیتے رہیں۔ پھر اس حکومت کی جگہ کرنسکی کی حکومت نے لے لی۔ ۴/ اپریل کو لینن پہنچا اور جاتے ہی ایک تقریر کی جس میں بتایا کہ زاروں کے نظامِ حکومت کا خاتمہ اصل انقلاب نہیں، بلکہ انقلاب کا آغاز ہے۔ اب متوسط طبقے نے جو حکومت بنالی ہے وہ عوام کی خواہشات پوری نہیں کرسکتی۔

اس کے بعد کشمکش پر کشمکش شروع ہوگئی۔ لینن کے مخالفوں نے جعل سازی سے ایسی دستاویزیں تیار کرلیں جن سے ثابت ہو کہ لینن نے جو کچھ کیا در اصل حکومت جرمنی کی ہدایت کے مطابق کیا۔ ان حالات میں لینن کو پھر روپوش ہونا پڑا۔ اس نے کچھ مدت پیٹروگراڈ میں گزاری، بعد ازاں فن لینڈ چلا گیا۔

جو کام لینن پُورا نہیں کرسکا تھا، وہ روسی حکومت کی احمقانہ پالیسی نے پُورا کر دیا۔ اختلافی قوتوں کو دبانے کے لیے ہلکی سی دہشت انگیزی کا دَور شروع ہوا۔ اس سے عوام بھی برگشتہ ہوگئے۔ بالشویکوں کو پیٹروگراڈ اور ماسکو کی مجالس میں اکثریت حاصل ہوگئی اور اُنھوں نے مطالبہ کیا کہ اختیارات ہمارے حوالے کر دیئے جائیں۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں کرنسکی کی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا اور پرولتاری ڈکٹیٹری قائم ہوگئی۔ بالشویکوں کی مجلس نمائندگانِ عوام[1] کو اختیارات مل گئے۔ اس مجلس نے لینن کو اپنا صدر منتخب کر لیا۔ اس طرح وہ عملاً ڈکٹیٹر بن گیا۔ ٹراٹسکی، اسٹالین، رائی کوف مجلس کے ممبر تھے۔

اس مجلس نے متحارب قوموں کے سامنے متارکۂ جنگ کی تجویز پیش کر دی۔ روس میں ذاتی ملکیّت کا حق منسوخ کر دیا گیا۔ صنعتیں قومی بنا دی گئیں۔ لینن نے صلح کا جو وعدہ کیا تھا وہ معاہدۂ برسٹ لٹوسک[2] کے مطابق ذلّت خیز شرطوں کی منظوری سے پُورا کیا گیا، لیکن رُوس کے مغربی ہمسایوں کے خلاف جنگ ۱۹۲۰ء تک ختم نہ ہوئی۔ لینن پر بیماری کے تین حملے پے درپے ہوئے۔ پہلا ۱۹۲۲ء میں، دُوسرا ۱۹۲۳ء میں اور تیسرا ۱۹۲۴ء میں۔ آخری حملے نے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

۱- Council of People's Commissars ۲- Brest-Litovsk
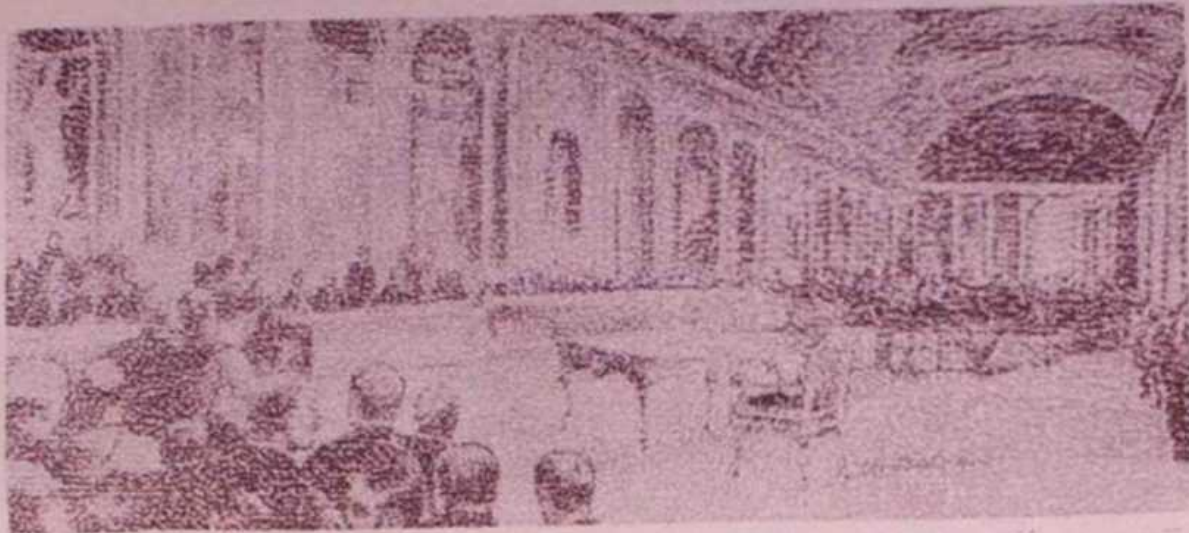
اتحادی صلح نامے تیار کرتے ہیں

۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کو متارکۂ جنگ پر دستخط ہوئے تھے اور عالمگیر اقتدار کے لیے جو وحشیانہ اور خونریز کشمکش چار سال سے جاری تھی، وہ ختم ہوگئی۔ قیصر کے جرمن ہار گئے۔ ۱۹۱۹ء میں ورسائی کے مقام پر مستقل صلح کے لیے مشورے شروع ہوئے۔ برطانیہ، امریکہ اور فرانس کے نمائندوں نے فاتحین کی حیثیت سے جو شرطیں پیش کیں ان پر خود ان ملکوں کے شہریوں کو پشیمان ہونا پڑا۔

ان شرطوں کے مطابق جرمنی سے نوآبادیاں چھین لی گئیں۔ مشرقی پروشیا اور جرمنی کے درمیان پولینڈ کے لیے گزرنے کا راستہ پیدا کیا گیا۔ سار کے علاقے کا انتظام چار سال کے لیے فرانس نے سنبھال لیا۔ رہائن لینڈ پر اتنی ہی مدت کے لیے اتحادی قابض ہوئے۔ جرمنی کا فوجی نظام توڑ دیا گیا۔ یہ بھی طے ہوگیا کہ قیصر اور بعض دوسری بڑی بڑی شخصیتوں کے خلاف مقدمے چلائے جائیں (جو کبھی نہ چلائے گئے)، تاوان کی ایسی رقمیں مقرر کر دی گئیں، جن کا ادا ہونا ممکن نہ تھا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کی ادائیگی ملتوی کی گئی، پھر کبھی یہ سلسلہ جاری نہ ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں ہٹلر نے عہدنامے کی ان تمام دفعات کو لغو و بے بنیاد قرار دیا، جن کا تعلق فوجی معاملات سے تھا۔

امریکہ کے صدر ولسن کے نزدیک یہ شرطیں اگرچہ سخت تھیں، لیکن بادلِ ناخواستہ قبول کر لی گئیں، تاکہ اتحادیوں نے پہلے سے جو خفیہ معاہدے کر رکھے تھے وہ پورے ہو جائیں۔ ولسن یہ چاہتا تھا کہ جس طور بھی ممکن ہو جمعیتِ اقوام کی بنیاد رکھ دے، جو اس کے نزدیک آئندہ کے لیے قیامِ امن کی واحد امیدگاہ تھی۔ اس نے فرانس اور برطانیہ سے جمعیتِ اقوام کا قیام منظور کرا لیا، مگر وہ امریکی سینٹ سے عہدنامہ ورسائی کی منظوری حاصل نہ کر سکا۔ یوں امریکہ کے لیے جمعیت اقوام کا ممبر بننے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی اور اس جمعیت کی تقدیر پر ناکامی کی آخری مہر لگ گئی۔

اس جنگ کو عالمگیر جنگ قرار دینا صحیح نہیں،

اس لیے کہ لڑائی بھڑائی زیادہ تر یورپ ہی کے اندر محدود رہی، تاہم ساڑھے چھ کروڑ سپاہی نقل و حرکت میں آئے اور ان میں سے نصف سے زیادہ مارے یا زخمی ہوئے یا قید کر لیے گئے۔ بایں ہمہ اس میں فیصلہ کن لڑائی کوئی نہ ہوئی۔ حد یہ ہے کہ جب جرمنوں نے ہتھیار ڈالے تو وہ فرانس سے کریمیا تک اتحادی علاقوں پر قابض تھے۔ برطانیہ اور فرانس نے دریائے سوم[1] کے ساتھ جو جارحانہ اقدام کیا تھا، اس میں چھ لاکھ آدمی موت کے گھاٹ اُتر گئے اور صرف چند میل کا علاقہ دشمن سے چھینا جا سکا۔ بیشتر سپاہیوں نے خندقوں میں بیٹھے بیٹھے تکلیفوں اور مصیبتوں کے سیل اپنے اُوپر سے گزار دیے جن میں پانی اور کیچڑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس ڈرامے میں پیش قدمی یا پسپائی کا کوئی طوفانی منظر رونما نہ ہوا، جیسے پیشتر یا بعد کی جنگوں میں اکثر سامنے آتے رہے۔

۱۹۱۴ء میں یورپ کے حالات اتنے متوازن اور مُستحکم تھے کہ صدیوں سے یہ کیفیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ گویا بظاہر جنگ کی کوئی وجہ نہ تھی، تاہم جنگ ہوئی اور اس کے بعد یورپ میں مزید رزم و پیکار کے عوامل کی پرورش شروع ہو گئی۔ اٹلی جنگ میں کوئی مؤثر حصہ نہ لے سکا تھا، لیکن وہاں فاشزم کا پہلا خوفناک مظاہرہ مسولینی کی شکل میں ہُوا۔ ہٹلر عہد نامہ ورسائی کی سیڑھی لگا کر جرمنی میں اوجِ اقتدار پر پہنچا اور وہاں نازی انداز کا فاشزم ظہور میں آیا۔ فرینکو نے ہسپانیہ میں اقتدار حاصل کر لیا۔ غرض عہد نامہ ورسائی کی سیاہی کو خشک ہُوئے پُورے بارہ سال بھی نہ گزرے تھے کہ اخباروں میں خبروں پر تبصرے کرنے والے اصحاب جنگ نہیں، بلکہ آغازِ جنگ کی تاریخ کے بارے میں دلائل پیش کرنے لگ گئے۔

دونوں عالمگیر جنگوں میں امریکہ کو مجبوراً شریک ہونا پڑا۔ پہلی جنگ میں جرمن آبدوزوں کے حملوں نے شرکت کے سوا چارہ نہ چھوڑا، دُوسری جنگ میں جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا۔ دونوں موقعوں پر دشمنوں کا خیال تھا کہ امریکہ کی پُوری تیاری سے پیشتر آخری فیصلہ ہو جائے گا، لیکن دونوں موقعوں پر یہ تصوّر بالکل غلط اور بے بنیاد ثابت ہُوا۔

پریزیڈنٹ ولسن نے اپنے مشہور چودہ نکات کو جرمن جواگی کی بنیاد قرار دیا تھا، وہ نکات عہد نامہ ورسائی میں گم ہو گئے۔ ولسن نے جس جمعیت اقوام کو امیدگاہ بنایا تھا وہ ناکام رہی۔ دُوسری عالمگیر جنگ کے بعد مقاصدِ امن کے لیے بہتر نظام انجمن اقوام متحدہ کی شکل میں وجود پذیر ہُوا۔ اگرچہ اسے خطرات کے جھٹکے بھی لگتے رہے تاہم یہ اب تک دُنیا کی امیدوں کا مرکز چلی آ رہی ہے۔

Somme -۱

مسولینی ڈکٹیٹر بنتا ہے

۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۲ء کو بینٹو مسولینی نے اٹلی کی بڑھتی ہوئی بدنظمی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے سیاہ پوش فاشسٹوں کو روم پر پیشقدمی کا حکم دے دیا جنھیں اس نے فوج کی حیثیت سے منظم کر لیا تھا۔ شاہ وکٹر عمانوئل کے نظام حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی اور اسے کہیں سے امداد کی اُمید بھی نہ ہو سکتی تھی، لہٰذا اسے اجازت دینی پڑی کہ فاشسٹ شہر میں داخل ہوجائیں۔ مسولینی اس وقت میلان میں تھا، اُسے نئی وزارت بنانے کی دعوت دی گئی نئے وزیر اعظم نے یکے بعد دیگرے ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ کمزور نظامِ حکومت نے نہایت سخت اور بے پناہ ڈکٹیٹری کی حیثیت اختیار کر لی۔ مسولینی اور اس کے ساتھی دَورِ عروج میں یہ سمجھ کر خوش ہوتے رہتے تھے کہ روم کی دیرینہ عظمت از سرِ نو زندہ ہو گئی۔

مسولینی کا باپ پیشے کے لحاظ سے لوہار تھا اور اس نے معلمی بھی کی تھی۔ خود مسولینی بھی شروع میں کچھ دیر بچے پڑھاتا رہا۔ پھر وہ سوئٹزرلینڈ چلا گیا اور معمار بن گیا۔ بعد ازاں ایک اشتراکی اخبار کا ایڈیٹر بن گیا، مگر انقلابی سرگرمیوں کے باعث سوئٹزرلینڈ سے نکالا گیا۔ وہ آسٹریا پہنچا تو وہاں ایک اخبار سے وابستہ ہو گیا، لیکن حکام سے جھگڑا ہو گیا اور اسے آسٹریا کو بھی چھوڑنا پڑا۔ بعد ازاں وہ اٹلی میں ایک اشتراکی اخبار کا ایڈیٹر رہا۔

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد اس نے اشتراکی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنا اخبار جاری کر کے پُرانے رفیقوں کی مخالفت کرنے لگا۔ اسی زمانے میں جاہ و اقتدار کی اس حرص کے چہرے سے پردہ اُٹھ گیا جو آگے چل کر اُسے نیز اس کے ملک کو زوال کی گہرائیوں میں پہنچانے والی تھی۔ جنگ کے بعد اٹلی کے حالات خاصے بگڑ گئے تھے۔ اس زمانے میں مسولینی کو اپنے نئے اور خطرناک خیالات کے حامی مل گئے۔ یہ حامی زیادہ تر غریب یا بے روزگار تھے یا وہ سپاہی تھے جو جنگ میں ناکامی کی وجہ سے بے وقعت

سمجھے جاتے تھے۔ مسولینی نے انھیں ایک پارٹی کی شکل میں منظم کر دیا اور اس پارٹی کا نصب العین انتہا پسندانہ اور جنگجویانہ قومیت تھا۔ یوں فاشسٹ پارٹی کی بنیاد پڑی اور ممبروں کے لیے سیاہ وردی تجویز ہوئی۔

ملک میں بے روزگاری عام تھی۔ پے درپے ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ ان حالات نے مسولینی کے حامیوں کی تعداد بہت بڑھا دی۔ مئی ۱۹۲۱ء میں مسولینی اطالوی پارلیمنٹ کا ممبر بن گیا۔ نومبر میں اس نے فاشسٹ پارٹی کی باقاعدہ تنظیم شروع کر دی اور ایک سال کے بعد اٹلی میں پہلی فاشسٹ حکومت بن گئی۔

مسولینی کے طور طریقوں اور فلسفے سے اڈولف ہٹلر نے جرمنی میں کام لیا۔ شروع میں مسولینی ہٹلر کو حقیر سمجھتا تھا اور آسٹریا کے الحاق کی وہ جو کوششیں کر رہا تھا، مسولینی ان کا سخت مخالف تھا۔ ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے حبشہ پر حملہ کر دیا۔ اس پر تمام یورپی ملکوں سے مسولینی کے سیاسی تعلقات منقطع ہو گئے۔

اس وقت مسولینی اور ہٹلر ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ۱۹۳۶ء میں مسولینی اور ہٹلر نے ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں فرینکو کی طرف داری کی اور روم اور برلن کا محور معرض وجود میں آیا۔ ۱۹۳۹ء میں دونوں کے درمیان اتحاد کا عہد نامہ ہو گیا۔ مسولینی نے ہٹلر کو الحاق آسٹریا کی اجازت دے دی۔ اسی سال مسولینی کی وساطت سے میونخ کا مہلک عہد نامہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اپریل ۱۹۳۹ء میں مسولینی نے البانیہ پر قبضہ جما لیا۔ اس وقت ہٹلر کا ستارہ بہت بلندی پر پہنچ چکا تھا اور مسولینی کو محض ہٹلر کے طفیلی کی حیثیت حاصل تھی۔

ہسپانیہ اور حبشہ کی جنگیں اٹلی والوں کے نزدیک پسندیدہ نہ تھیں، اس لیے مسولینی کا وقار کم ہو گیا اور اسے دوسری عالمگیر جنگ میں شریک ہونے کی ہمت نہ ہوئی۔ جون ۱۹۴۰ء میں فرانس کی شکست کے آثار نمودار ہونے لگے تو اسے ہٹلر کے ساتھ شامل ہونے میں کوئی مضائقہ نظر نہ آیا۔ چنانچہ اس نے اچانک مظلوم فرانس کی پشت میں چھرا بھونک دیا۔

آخر اطالوی فوجوں نے افریقہ اور یونان میں سخت شکستیں کھائیں اور اٹلی اتحادی فوجوں کی زد میں آ گیا، جس سے فاشسٹ پارٹی میں بغاوت رونما ہو گئی۔ فاشسٹوں کی مجلس عالیہ نے ۲۵ جولائی ۱۹۴۳ء کو مسولینی کی پالیسی مسترد کر دی۔ بادشاہ نے اسے وزارت سے برطرف کر کے اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ دو ماہ بعد جرمن اسے رہا کرا لے گئے اور شمالی اٹلی میں ایک حکومت بنا دی جس کی حیثیت کٹھ پتلی کی تھی۔ جب جرمنی بھی لڑائی میں بے بس ہو کر رہ گیا تو مسولینی نے بھاگ کر سوئٹزرلینڈ پہنچنے کی کوشش کی، مگر کومو کے نزدیک پکڑا گیا اور سرسری تحقیقات کے بعد اُسے گولی مار دی گئی۔ اس کی نعش میلان میں پہنچی تو پاؤں میں رسّے ڈال کر چوک میں اُلٹا لٹکا دیا گیا۔ پھر کسی گمنام جگہ دفن کر دیا گیا۔ اس کا انجام اگرچہ بڑا حسرت ناک تھا، لیکن اس سے اٹلی کے لیے اقوام عالم میں شریک ہونے کا موقع پیدا ہو گیا۔

پنسلین ایجاد ہوتی ہے

اتّفاق اور تیز نگاہی کی فتح کا ایک شاندار کارنامہ سر الیگزانڈر فلیمنگ[1] کے ہاتھوں سینٹ میری کے ہسپتال (لندن) میں انجام پایا اور پنسلین ایجاد ہوئی۔ جسے دُنیا کی عجائب الاثر دوا سمجھا جاتا ہے سر الیگزانڈر پہلی عالمگیر جنگ میں برطانیہ کی میڈیکل کور کا رکن تھا۔ اسے یہ دیکھ کر حد درجہ قلق ہوتا رہا کہ اگرچہ زخمیوں کے لیے بروقت اعلیٰ درجے کی طبّی امداد کا انتظام کر دیا جاتا تھا پھر بھی خون میں زہریلے جراثیم پھیل جاتے کے باعث بے شمار موتیں واقع ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ میدانِ جنگ ہی میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ باقی زندگی ان جراثیم کی تحقیقات میں گزار دے گا جو زخمیوں کی موت کا باعث ہوتے ہیں۔

ایک روز وہ اپنی تجربہ گاہ میں کام کر رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ پیپ پیدا کرنے والے جراثیم پھپھوندی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے چپٹے ہوئے ہیں۔ اس نے خوردبین سے دیکھا تو جراثیم مر رہے تھے پھر اس نے پھپھوندی کے اثرات کا خوب تجربہ کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انسانی جسم میں زہر پیدا کرنے والے جراثیم کی اکثر قسمیں اسی سے ہلاک ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی تجربہ کر لیا گیا کہ پھپھوندی سے تیار کی ہوئی دوا انسانی جسم پر کوئی مضر اثر نہیں ڈالتی۔ اس تاریخی دریافت نے طبّی دُنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔

دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو آکسفورڈ میں سائنس دانوں کی ایک جماعت نے سر الیگزانڈر فلیمنگ کی دریافت کے متعلق باقاعدہ تجربات شروع کر دیئے۔ ۱۹۴۱ء میں تجربات کامیابی کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ پھر امریکہ کے تعاون سے وسیع پیمانے پر پنسلین کی تیاری شروع ہوگئی۔ جنگ میں بے شمار جانیں اس کی بدولت بچ گئیں۔

آج تمام ڈاکٹر اس سے وسیع پیمانے پر کام

۱۔ Alexander Fleming

لے رہے ہیں۔ یہ جسموں کو زہریلے اثرات سے محفوظ رکھنے میں بھی مؤثر ہے اور اگر کسی جسم میں سمیّت سرایت کر جائے تو اسے بھی جلد دُور کر دیتی ہے۔ اس کے بعد اسی قسم کی اور دوائیں بھی ایجاد ہوئیں، مثلاً ایرومائیسین، سٹرپٹومائیسین۔ سمیّت کو دُور کرنے والی زیادہ دوائیں اس وجہ سے خیر مقدم کی مستحق ہیں کہ بعض بیماروں کو پنسلین سے کوئی فائدہ نہ پہنچا، بلکہ اس کے استعمال سے انھوں نے سخت تکلیفیں اُٹھائیں۔ ڈاکٹر ایک دوا کو مؤثر نہیں دیکھتے تو دوسری استعمال کر لیتے ہیں۔ مثلاً تنفّس کی بیماریوں میں سمیّت کو دُور کرنے والی ایک دوا دُوسری کے مقابلے میں بہتر ثابت ہوئی ہے۔

پنسلین شروع میں ہمارے ہاں بھی کثرت سے استعمال ہونے لگی تھی، اب پہلے کا سا زور نہیں رہا اور دوسری دوائیں مثلاً ایرومائیسین، اسٹرپٹومائیسین وغیرہ زیادہ استعمال کی جاتی ہیں۔ پنسلین کی اور بہت سی چیزیں تیار کر لی گئی ہیں جو بڑی مفید ثابت ہوئی ہیں، یعنی پنسلین مرہم پھوڑوں پھنسیوں کے لیے، پنسلین آنکھوں یا دُوسرے اعضا کی بیماریوں کے لیے۔ نئی نئی چیزوں کی دریافت کے لیے مختلف ملکوں کے سائنس دان اور ڈاکٹر دن رات تجربات کر رہے ہیں۔ پچھلے دنوں خبر ملی تھی کہ دانتوں کو محفوظ رکھنے کی ایک دوا تیار ہو چکی ہے۔ جس کے اثرات کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ جرّاحی میں حیرت انگیز مہارت حاصل کی جا چکی ہے۔ اس طرح کچھ عجب نہیں کہ بہت جلد خطرناک بیماریوں پر قابو پا یا جا سکے۔ یہ سب کچھ خلقِ خدا کی خدمت کے لیے ہو رہا ہے اور جو لوگ اس کام میں مصروف ہیں، وہ یقیناً عالم انسانیت کے محسن ہیں۔

ہٹلر پولینڈ پر ہلّہ بولتا ہے

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہٹلر نے اپنی امن پسندانہ خواہشات بالائے طاق رکھ دیں اور پولینڈ پر وہ خوفناک یورش شروع کر دی جسے "بلٹز کریگ" کا نام دیا گیا یعنی ایسی یورش جس میں بجلی کی سی تیزی اور شدت ہو اور سمجھا جائے کہ دُوسرے پر پے در پے بجلیاں گرائی جا رہی ہیں۔ اس یورش نے پولینڈ کی فوجیں تباہ کر دیں۔ ملک کے بچاؤ کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا۔ نازیوں نے فتح کے بعد لطف و رحم سے کام لینے کی بجائے خوفناک ظلم وستم شروع کر دیئے۔ اس یورش نے ان لوگوں کی بھی آنکھیں کھول دیں، جو پیش نظر خطرات کے بارے میں بے پروائی برت رہے تھے۔ خود امریکہ کی کانگریس کے تقریباً نصف ممبر اگست ۱۹۴۱ء تک یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ اس جنگ میں ان کے ملک کے لیے بھی واقعی خطرہ ہے۔

پولینڈ کے لیے وہی ایک راستہ تھا جس پر وہ گامزن ہؤا۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد اس کے لیے ایک گزرگاہ تجویز کی گئی تھی جو جرمنی کے سابقہ مقبوضات میں سے گزرتی تھی۔ پولینڈ کو ساحل بحر تک پہنچانے کی اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ ہٹلر نے اس گزرگاہ کی واپسی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اس بارے میں سیاسی گفت و شنید حد درجہ مختصر سی تھی۔ پھر نازیوں کے ہوائی جہاز، ٹینک، مسلح دستے اور اعلیٰ تربیت پائی ہوئی پیادہ فوجیں طوفان کی طرح اُٹھیں اور پُرانی وضع کے پولستانی رسالوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ ہٹلر ان اسلحہ کو ہسپانوی خانہ جنگی کی تجربہ گاہ میں خوب آزما چکا تھا (۱۹۳۶ء۔ مارچ ۱۹۳۹ء)۔ یہ سب کچھ اس تیزی سے عمل میں آیا کہ برطانیہ اور فرانس بمشکل اعلانِ جنگ کر سکے اور روس نے دوسری جانب سے پولینڈ پر ہلّہ بول دیا۔

موسم سرما میں جنگ کی تیزی باقی نہ رہی، البتہ رُوس فن لینڈ سے اُلجھا رہا۔ فرانس نے اپنی فوجیں میجنو لائن کے استحکامات سے ہٹا دیں جنھیں ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ برطانیہ نے معمول کے مطابق دشمن

کے ملک کی ناکہ بندی کر لی۔ ہٹلر موقع کے انتظار میں بیٹھ گیا، گویا کہ جنگ محض دکھاوے کے لیے رہ گئی تھی۔

اپریل ۱۹۴۰ء کے اوائل میں تیز نقل و حرکت کی نئی جنگ کے مہلک ممکنات آشکارا ہوگئے۔ جرمنوں نے ڈنمارک اور ناروے پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ کی بحری قوّت نے ناروے میں دفاع کا حق ادا کر دیا، لیکن اس کی کوششیں بے سود رہیں۔ مئی میں جرمن فوجیں لکسمبرگ، ہالینڈ اور بلجیم کو پامال کرتی ہوئی حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ میجنو لائن کے ایک طرف سے چکّر کاٹ کر آگے بڑھیں اور رود بار انگلستان کے ساحل پر پہنچ گئیں۔ برطانیہ ڈنکرک سے فوجیں نکالنے پر مجبور ہو گیا اور چرچل لامتناہی زد و کشت سے دوچار ہو گیا۔ دُوسرے لفظوں میں اتحادی برِاعظم سے نکالے جا چکے تھے۔ نہ ان کے پاس فوج تھی، نہ سامانِ جنگ۔ فرانس نے ۲۲ر جون کو جرمنی کے ساتھ متارکے پر دستخط کر دیئے۔

اس کے بعد جرمنوں نے برطانوی شہریوں پر وحشیانہ اور انسانیت سوز ہوائی حملے شروع کر دیئے۔ ان سے کوئی فوجی مقصد تو پُورا نہ ہوا، البتہ غیر مصافی آبادی کو جو جانی و مالی نقصان پہنچا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ پے در پے ضربوں نے برطانوی عوام میں مزاحمت کا عزم مستحکم کر دیا اور برطانیہ کے لڑاکا ہوائی جہازوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ دُشمن کے جہازوں کو فنا کے گھاٹ اُتارنے کی صورتیں کیا کیا ہیں۔ جرمن آبدوزیں بھی اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں۔

۲۲ر جون ۱۹۴۱ء کو ہٹلر نے نپولین کی غلطی دُہرائی اور رُوس پر حملہ کر دیا۔ نتیجہ وہی نکلا جو نپولین کو پیش آیا تھا۔ ابتدا میں ہٹلر کو زبردست کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ جرمن پسپا ہوتی ہوئی رُوسی فوجوں کا تعاقب کرتے رہے۔ پھر لینن گراڈ جیسے محاصروں کی کھینچ تان شروع ہوئی۔ انجام کار روسیوں نے بے پناہ جوابی ضربوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

اسی سال ہٹلر کے حلیف جاپان نے مشرق بعید میں بدتر غلطی کا ارتکاب کیا اور ۷ر دسمبر کو پرل ہاربر پر اچانک حملہ کر دیا جس کی وجہ سے امریکہ کو جنگ میں شامل ہونا پڑا اور اس میں کوئی شبہ نہ رہا کہ چرچل جیسے آدمیوں کی استقامت ضرور رنگ لائے گی۔ حق یہ ہے کہ انگریزوں نے بے درد اور اخلاق سوز جابرانہ قوّت کے خلاف جس حوصلہ مندی سے کام لیا وہ یقیناً بہتر نتیجے کی مستحق تھی۔
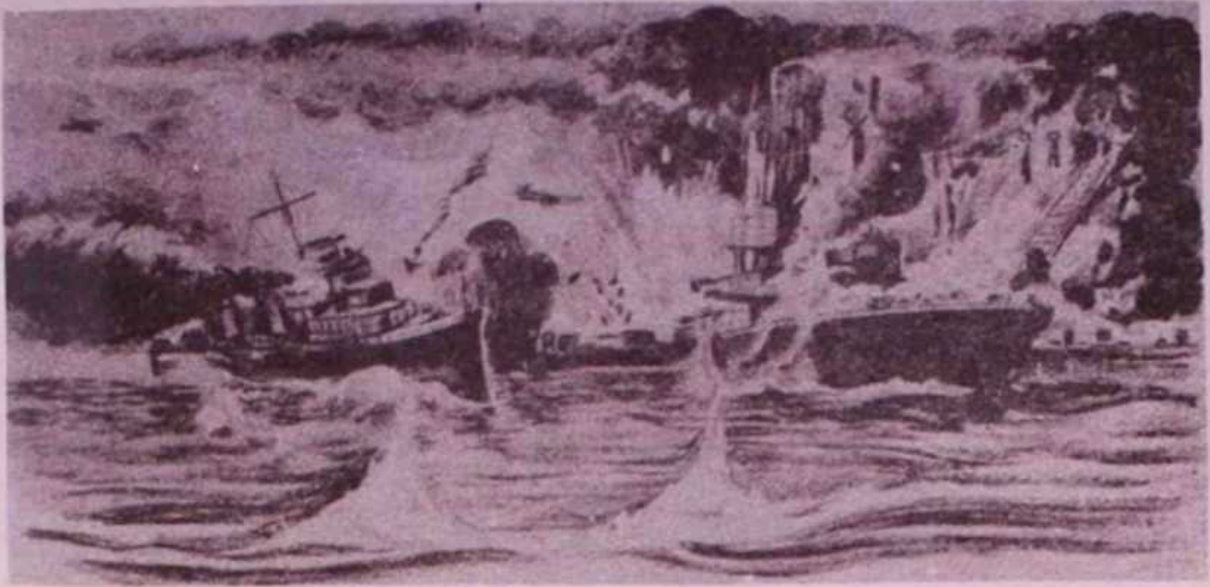
جاپان، پرل ہاربر پر بم برساتا ہے

جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کا ایک خاص گُر یہ ہے کہ دشمن پر اچانک اور غیر متوقع حملہ کیا جائے وہ مقابلے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور پہلے ہی قدم پر سخت نقصان کا ہدف بن جاتا ہے جس کی تلافی آسان نہیں ہوتی - یہی وجہ ہے کہ سپہ سالار ہمیشہ اچانک حملوں کے لیے کوشاں رہے - جاپان نے ۷ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو امریکہ کے مشہور بحری مرکز پرل ہاربر (جزیرہ ہوائی) پر جو حملہ کیا تھا، وہ بھی اسی قسم کا تھا اور اس میں جاپان کو جس بڑے پیمانے پر کامیابی حاصل ہوئی، وہ کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ تھی - اتوار کا دن حملے کے لیے یقیناً اس خیال سے تجویز کیا گیا تھا کہ بحری مرکز کے اکثر افسر اور ملاح معمول کے مطابق چھٹی منا رہے ہوں گے اور بڑا مزاحمت کرنا بھی چاہے گا تو نہ کر سکے گا۔

آپ اس حملے کے نتائج پر غور فرمائیں۔ بحرالکاہل کا امریکی بیڑا اپاہج بن چکا تھا۔ اگر جاپان آگے بڑھ کر کیلیفورنیا کے ساحل پر فوج اُتار دیتا تو وہاں حقیقی حفاظت کا کوئی قابلِ ذکر سامان موجود نہ تھا۔ پھر اسی دن جاپان نے فلپینز، ویک[۱] اور گوام[۲] کے ہوائی مرکزوں پر یورشیں کیں - مشرق وسطیٰ میں برطانوی اور ولندیزی مقبوضات کے جنگی مرکزوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ بحرالکاہل کے وسیع سمندر میں برطانیہ اور ہالینڈ ہی امریکہ کے ساتھی بن سکتے تھے، وہ کوئی قابلِ ذکر مدد دینے کے قابل نہ تھے۔ امریکی فوجوں کے کمانڈر ڈگلس میک آرتھر[۳] نے بطان[۴] (فلپینز) میں دفاع کا بڑا پروپیگنڈا کیا، لیکن وہ آبدوز میں سوار ہو کر بچ نکلنے پر مجبور ہوا، تاکہ اس فوج کی تیاری کا کام انجام دے جس کے بغیر وہ جاپان کے خلاف جوابی قدم نہ اُٹھا سکتا تھا اور واپس فلپینز نہ پہنچ سکتا تھا۔

۱- Wake بحرالکاہل میں ایک امریکی جزیرہ۔ ۲- Guam بحرالکاہل میں ایک امریکی جزیرہ۔

۳- Douglas MacArthur ۴- Bataan

چیانگ کائی شک سے مدد کی امید ہو سکتی تھی، لیکن وہ خود جاپان کی ضربوں سے سنبھل نہ سکا تھا۔

بے شک امریکہ کے لیے یہ بڑی پریشانی کا وقت تھا۔ اگر زیادہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ بھی فوجی تیاریاں شروع کر دی جاتیں تو ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ پہلے زیادہ سے زیادہ سامان اور فوجیں ہٹلر کے مقابلے پر بھیجنی ضروری تھیں جو جاپان کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ خطرناک تھا اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے انتظامات مکمل کیے بغیر جاپان پر پوری توجہ نہ کی جا سکتی تھی۔ لہٰذا جاپان کو جوابی کارروائیوں کا بھی زیادہ اندیشہ نہ تھا۔ تاہم خود جاپان پر بہت جلد واضح ہو گیا کہ وہ اتنے علاقے ہتھیا چکا تھا، جنھیں ہضم کر لینا بہت مشکل تھا۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جاپانی مرکزوں پر براہِ راست اقدام نہ کیا جا سکتا تھا، بلکہ جزیرہ بہ جزیرہ چھلانگیں لگاتے ہوئے بھی قریب پہنچنا ناممکن تھا۔ تاہم جب تیاریاں ہو گئیں اور بری، بحری اور ہوائی قوت نے ہم آہنگی سے اقدامات کی صلاحیت بہم پہنچائی تو نتیجہ نہایت شاندار نکلا۔

جاپان نے پہلی عالمگیر جنگ اور دوسری عالمگیر جنگ کے درمیان میں اربوں روپے خرچ کر کے جو مرکز بنائے تھے، وہ بہت مستحکم سمجھے جاتے تھے۔ انھیں یا تو ایک طرف چھوڑ دیا گیا یا امریکی بیڑے نے انھیں رسد سے محروم کر کے طبعی موت مرنے دیا یا ہوائی، بری اور بحری حملے اس شدت سے کیے گئے کہ جاپانی کمانڈر فیصلہ ہی نہ کر سکے کہ وہ کیا کچھ انجام دے سکتے ہیں اور کیا نہیں دے سکتے۔ بعض مقامات پر بڑی خوفناک اور خونریز لڑائیاں پیش آئیں، جیسا کہ جزیرہ آیوجیما[1] میں۔ جنگلات کے اندر نوجوان امریکیوں کو بڑی مشکلات سے سابقہ پڑا۔ آخر میک آرتھر لوزان (فلپینز) پہنچ گیا اور ویسی ہی کھلی لڑائیاں شروع ہو گئیں جیسی یورپ میں ہو رہی تھیں۔ امریکی سپاہی سمجھے بیٹھے تھے کہ فلپینز پہنچیں گے تو منیلا[2] میں وہ تمام سامان موجود ہوں گے جو آج کل کے متمدن شہروں میں ہوتے ہیں، لیکن وہ اس درجہ تباہ ہو چکا تھا کہ ہٹلر کے بم باروں نے ایسی تباہی کہیں نہ پھیلائی تھی۔

اب جاپان پر براہِ راست یورش کا مرحلہ سامنے آ گیا تھا جہاں لاکھوں سپاہی مقابلے کے لیے موجود تھے اور اس میں جلد کامیابی کی اُمید نہ تھی۔ اچانک ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرے جن سے بیشمار غیر مصافی آبادی موت کے گھاٹ اُتر گئی۔ جاپان مزید لڑائی کے بغیر ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو گیا اور لاکھوں امریکیوں کے لیے گھر واپس جانے کی صُورت نکل آئی۔

۱- Iwo Jima ۲- Manila فلپینز کا دارالحکومت۔

جرمنی ہتھیار ڈالتا ہے

جرمنی کی جس جنگی قوت کے متعلق عام خیال یہ ہوگیا تھا کہ اسے توڑا نہیں جاسکتا، وہ شمالی افریقہ، سسلی، اٹلی اور بلقان میں بہت بُری طرح پسپا ہوچکی تھی اور ہٹلر کی قوت کے قلب پر ضرب لگانے کا وقت آگیا تھا۔ یہ ان عظیم الشان جنگی استحکامات پر براہِ راست حملہ تھا جو جرمنوں نے برِاعظم یورپ کی حفاظت کے لیے کر رکھے تھے۔ اس کے لیے فرانس میں فوجیں اُتارے بغیر چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ۶ر جون ۱۹۴۴ء کو اس یورش کا بھی آغاز ہوگیا۔ جنرل آئزن ہاور تمام افواج کے سپہ سالار مقرر ہُوئے۔

جرمن آبدوزوں کی قوت ۱۹۴۳ء کے اواخر ہی میں توڑ دی گئی تھی۔ بے اندازہ سامان امریکہ سے برطانیہ پہنچا دیا گیا تھا۔ ہوائی جہازوں کے بیڑے جرمنی کے جنگی اور صنعتی مرکزوں کو بُری طرح تباہ کر چکے تھے، لیکن نارمنڈی کے ساحلی علاقے کے ساتھ ساتھ ایسے استحکامات بدستور موجود تھے جن کے متعلق باہر سے صحیح اندازہ نہ ہوسکتا تھا۔ ان کے پیچھے بیشمار توپیں، مسلح جنگی دستے اور زبردست فوجیں موجود تھیں۔ یہ بہت ہی خوفناک جنگی قوت تھی۔

اتحادیوں نے چھ جون کو آدھی رات کے وقت ہوائی جہازوں کے ذریعے تین ڈویژن فوج جرمن استحکامات کے پیچھے اُتار دی۔ اس میں ایک ڈویژن برطانوی تھا اور دو امریکی۔ سُورج نکل آیا تو امریکہ کی پہلی فوج جنرل بریڈلے کی سرکردگی میں اور برطانیہ کی دُوسری فوج جنرل منٹگمری کی سرکردگی میں ساحلِ فرانس پر اُترنے لگیں اور کس اہتمام کے ساتھ؟ چار ہزار جہاز فوجیں اور سامان لانے لے جانے کے لیے رودبار میں مسلسل چکر لگا رہے تھے۔ آٹھ سو جنگی جہازوں نے ان کی حفاظت کے لیے فولادی دیوار قائم کر رکھی تھی اور گیارہ ہزار ہوائی جہازوں نے سر پر سائبان تان رکھا تھا۔ جنگی قوت کا یہ ایسا نظارہ تھا جو ۶ر جون ۱۹۴۴ء سے پیشتر سُورج کی آنکھ نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

ابتدائی مرکز حاصل کرنے میں بڑی خوفناک

لڑائیاں ہوئیں اور سخت جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔ پھر شربورگ اور رودبار کی دُوسری بندرگاہوں پر قبضہ جمانے میں شدید مشکلات پیش آئیں، لیکن نارمنڈی پر قبضہ ہوگیا تو اتحادی فوجیں سیل کی طرح فرانس میں پھیل گئیں۔ پیرس کو خود وہاں کے رضاکار عساکر نے آزاد کرالیا۔

مشرقی جانب سے سٹالن کے طوفانی لشکر بڑھے چلے آرہے تھے۔ اٹلی میں بھی اتحادیوں کی پیش قدمی جاری تھی، اگرچہ اس کی رفتار تیز نہ تھی۔ ہٹلر نے ایک مقام پر جوابی حملے کا انتظام کیا اور جرمن فوجیں دُور تک بلجیم کے اندر گھس گئیں۔ اس اثنا میں ہوائی بموں کی بارش ان بندرگاہوں پر جاری تھی جہاں سے اتحادی فوجوں کو سامانِ رسد بھیجا جارہا تھا، لیکن یہ حملہ ناکام بنا دیا گیا اور اس میں چار ہزار امریکی جانوں کی قربانی دینی پڑی۔

آخر برلن پر حملہ ہوا جہاں ہٹلر دیر تک لڑتا رہا۔ حالانکہ اس مزاحمت میں عقل کا کوئی پہلو نہ تھا۔ پھر اس نے خودکشی کرلی۔ اتحادی فوجوں نے برلن پہنچنے میں تھوڑی سی دیر لگا دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری طرف سے رُوسی فوجیں پہنچ گئیں اور اُنھوں نے برلن میں قدم جما لیے۔ بعد کے واقعات نے واضح کردیا کہ کاش اتحادی فوجیں برلن پر قبضہ کرنے میں دیر نہ کرتیں اور ان پیچیدگیوں کا دروازہ بند ہو جاتا جو اب تک پریشان کررہی ہیں۔ ۷رمئی ۱۹۴۵ء کو جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے۔

اقوامِ متحدہ کا منشور تیار ہوتا ہے

پہلی عالمگیر جنگ ختم ہوئی تو دُنیا میں امن قائم رکھنے کی غرض سے جمعیّت اقوام کی بنیاد رکھی گئی، لیکن یہ حکومتوں کی جمعیت تھی اور حکومتیں اپنی خاص مصلحتوں کو انسانوں کی عام مصلحتوں کے لیے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا کرتیں۔ دُوسری عالمگیر جنگ میں ہٹلر اور مسولینی شکست کھا چکے تو ۲۶ر جون ۱۹۴۵ء کو سان فرانسسکو میں "انجمن اقوام متحدہ" کے منشور پر دستخط ہوئے۔ یہ دُوسرا نظام تھا جو امن عالم کی حفاظت کے لیے بنایا گیا تھا۔ جمعیّت اقوام کے مقابلے میں اس کی امتیازی حیثیت یہ ہے کہ اُسے واقعی قوموں کی انجمن بنایا گیا تھا۔

جمہوریہ امریکہ کے صدر فرینکلن روزویلٹ نے اقوامِ متحدہ کا جملہ پہلے پہل ان ملکوں کے لیے استعمال کیا تھا جو ایک دُوسرے کے دوش بدوش کامل یکجہتی سے ہٹلر، مسولینی اور جاپان کے خلاف لڑ رہے تھے لیکن دَوران جنگ کے یہ ساتھی بعد میں ہم رائے نہ رہ سکے اور ان میں اختلافات پیدا ہو گئے، جس کی وجہ سے یہ بین الاقوامی انجمن پُوری کامیابی سے کارفرما نہ رہ سکی اور دنیا کی قوموں نے اس کے ساتھ جو امیدیں وابستہ کی تھیں، وہ آرزو کے مطابق پُوری نہ ہو سکیں، لیکن سیاسی رائے میں اختلافات کے باوجود یہ انجمن جو عملی کام اب تک انجام دے چکی ہے، بڑا ہی قابل قدر ہے اور وہ تمام قوموں کی ضرورتوں اور امیدوں کا جائزہ انسان ہونے کی حیثیت سے لے رہی ہے۔

بے شک اس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا میں امن قائم رہے، لیکن اس کے ابتدائی ممبروں نے قواعد میں بعض ایسے تحفظات کا بندوبست کر لیا، جن کے مطابق بڑے ملکوں کے مفاد کی حفاظت ہو سکے مثلاً وِیٹو کی دفعہ۔ افسوس کہ بعض ملکوں نے مقاصد امن پیچھے پھینک دیئے اور اپنے مادّی فوائد سامنے رکھ کر وِیٹو کو پے در پے استعمال کیا۔ اس طرح یہ دفعہ انجمن اقوام متحدہ کی ایک بڑی خامی بن گئی۔ حقیقت پر نظر رکھی

جائے تو وِیٹو کا اصل مُدعا صرف یہ تھا کہ بڑے ملکوں کے داخلی معاملات میں دُوسری قوموں کے لیے مداخلت کا دروازہ نہ کُھل جائے۔

جن مدبّروں نے انجمن اقوامِ متحدہ کا تاریخی منشور مرتّب کیا، وہ جانتے تھے کہ محض سیاسی تدبیروں سے کام لے کر امن قائم نہیں رکھا جاسکتا، اس لیے کہ جو علاقے اقتصادی لحاظ سے پس ماندہ تھے اور ان کی عام حالت بہت پست تھی، وہاں جنگی جراثیم کی پرورش کے پُورے سامان موجُود تھے۔ ضروری تھا کہ رُوئے زمین کے جن حصّوں میں انسانوں کے لیے ترقی کے معقول ذریعے موجُود نہ تھے، وہاں درجہ معیشت کو بلند کرنے پر خاص توجہ مبذول کی جاتی۔ اس غرض سے انجمن اقوام متحدہ نے کئی مستقل شاخیں قائم کردیں، مثلاً بین الاقوامی مزدوروں کی بہتری اور بہبود کا کام، نیز خوراک اور زراعت کا کام الگ الگ شاخوں کے حوالے کردیا گیا۔ بچّوں کی بہبود کے لیے ایک شاخ قائم ہوگئی۔ حفظانِ صحت کے لیے ایک جُداگانہ نظام بنا دیا گیا۔ یہ اور اسی قسم کی دُوسری رفاہی شاخوں نے تھوڑی ہی مدت میں جو کارنامے انجام دیے وہ یقیناً قابلِ قدر ہیں۔

حفظانِ صحت کے نظام نے نگرانی اور تحفظ کا ایک عالمگیر جال بچھا دیا ہے۔ کہیں وبا پھُوٹنے کا اندیشہ ہو تو فوراً انسدادی تدابیر اختیار کرلی جاتی ہیں اور تمام ملکوں کو قبل از وقت آگاہ کردیا جاتا ہے۔ بعض خطرناک بیماریوں کے علاج کا انتظام جابجا شروع کردیا گیا ہے۔ بین الاقوامی پرواز کے شعبے نے سمندر میں جابجا جہاز متعین کردیے ہیں جو سب کو موسموں کی خبریں پہنچاتے رہتے ہیں اور اگر کوئی حادثہ پیش آجائے تو فوراً بچاؤ اور امداد کا کام شروع ہوجاتا ہے۔ خوراک اور زراعت کے شعبے نے مختلف ملکوں میں ان اجناس کی کاشت کا بندوبست کردیا ہے جو کاشت نہ ہوتی تھیں، حالانکہ ان کی ضرورت تھی۔ ڈاک کی عالمگیر یونین نے خطوط کو کم سے کم خرچ پر جلد سے جلد پہنچانے کا بندوبست کردیا ہے۔ گویا قوموں میں نہیں، بلکہ انسانوں میں ہمدردی اور تعاون کا کام وسیع پیمانے پر شروع ہوچکا ہے، البتہ نتائج کے لیے ہمیں کچھ دیر مزید انتظار کرنا ہوگا۔

غرض انجمن اقوامِ متحدہ اب تک جس راستے پر گامزن رہی ہے، نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مشکلات سے بالکل خالی تھا اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سفر سراسر خوشگوار تھا، لیکن اس حقیقت سے غالباً کسی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اس راستے پر سفر جاری رکھا جاسکتا ہے اور امید کا یہ چراغ برابر روشن چلا آتا ہے کہ انجام کار یہ راستہ امن کی منزلِ مقصود پر پہنچا دے گا۔

جن ملکوں نے ابتدا میں منشور پر دستخط کیے تھے ان کے نام یہ ہیں: ارجنٹینا، آسٹریلیا، بلجیم، بولیویا، برازیل، روس، کینیڈا، چلّی، چین، کولمبیا، کاسٹاریکا، کیوبا، چیکوسلواکیا، ڈنمارک، جمہوریہ سانٹو ڈومنگو، ایکواڈور، مصر، سالواڈور، حبشہ، فرانس، یونان، گواٹی مالا، ہیٹی، ہانڈوراس، ہندوستان، ایران، عراق، لبنان، لائبیریا، لکسمبرگ، میکسیکو، ہالینڈ، نیوزی لینڈ، نکاراگوئے، ناروے، پاناما، پیراگوئے، پیرو، فلپینز، پولینڈ، دولت عربیہ سعودیہ، شام، ترکی، یوکرین، جنوبی افریقہ، جمہوریہ بیلو روس، جمہوریہ روس، برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، یوراگوئے، وینزویلا، یوگوسلافیا۔[1]

۱۔ ان میں پاکستان کا ذکر نہیں، لیکن معلوم رہے کہ جُون ۱۹۴۵ء میں پاکستان بنا ہی نہ تھا۔ یہ ملک ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند سے معرضِ وجُود میں آیا اور انجمن کا ممبر بن گیا۔

ہیروشیما پر ایٹم بم گرتا ہے

۶ اگست ۱۹۴۵ء نے جاپان کے چھوٹے سے شہر ہیروشیما کے نام کو اس لحاظ سے بقائے دوام کا لباس پہنا دیا کہ ایٹم بم پہلی مرتبہ اسی شہر پر استعمال ہوا اور تین روز بعد ناگاساکی پر دُوسرا بم گرا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے اور دوسری عالمگیر جنگ ختم ہو گئی۔

مادّے کے چھوٹے سے چھوٹے ذرّے کو توڑ کر اس کی ظاہری قوّت سے کام لینے کا خیال نیا نہ تھا۔ طبیعیات کے ماہر مدّت سے اس کام میں لگے ہُوئے تھے۔ آئن شٹائن نے بعض ایسے نظریات قائم کیے جن کے مطابق عملی تجربوں سے ایٹم بم تیار کرنے کی صورت نکل آئی۔ آئن شٹائن ہی نے پریزیڈنٹ روزویلٹ کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ جتنا بھی روپیہ خرچ ہو، بے دریغ خرچ کیا جائے، اس لیے کہ ہٹلر کے سائنس دانوں کو شکست دینے کی اس کے سوا کوئی صُورت نہ تھی۔ چنانچہ سائنس دانوں کی ایک جماعت کو اس کام پر لگا دیا گیا۔ ان کی مجموعی کوششوں سے ذرّے کو پھاڑنے کی تدبیر عمل میں آگئی اور قوت کا وہ خوفناک ذخیرہ ہاتھ آگیا، جس کا یقین سب کو تھا کہ ضرور دستیاب ہوگا۔

ایٹم بم تیار ہو گیا، لیکن اسے استعمال کرنے کا فیصلہ امریکہ کے پریزیڈنٹ ہیری ٹرومین پر موقُوف تھا اور اس کے استعمال کے لیے کوئی معقول وجہ درکار تھی۔ جاپان کی بحری اور ہوائی قوّت پوری طرح تباہ ہو چکی تھی، لیکن اس کی برّی قوّت بہ دستور بے پناہ تھی۔ جب تک جاپان پر حملہ کرکے اس برّی قوت کو ختم نہ کیا جاتا، جنگ ختم نہ ہو سکتی تھی۔ خدا جانے اس میں کتنی دیر لگتی اور جاپان کے علاوہ خود اتحادیوں کو کتنا وسیع جانی نقصان برداشت کرنا پڑتا۔ چنانچہ پریزیڈنٹ ٹرومین نے ایٹم بم کے استعمال کی اجازت دے دی اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، پہلے یہ بم ہیروشیما پر، پھر ناگاساکی پر استعمال ہُوا۔

ہیروشیما میں ایک بم نے جو قیامت برپا کی، اس کا سرسری اندازہ یُوں ہو سکتا ہے کہ کم و بیش ڈیڑھ لاکھ افراد مارے گئے یا زخمی ہوئے یا پاگل ہو گئے۔ شہر کی تین چوتھائی عمارتیں ملبے کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہیروشیما کی آبادی میں سے جو لوگ بچے، ان کے بچّوں، پوتوں، پڑپوتوں پر اس بم کے اثرات کن کن صورتوں میں رُونما ہُوئے یا ہوں گے۔

پاک و ہند سے یورپ کا تعلق پیدا ہوتا ہے

ہندوستان کے ساتھ یُونان کے ربط وضبط کی ابتدا اسکندر اعظم کے حملے سے ہوتی ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اس ربط وضبط کے بعد یونانیوں نے ہندوستان کے بارے میں جو کچھ لکھا وہی اس وسیع ملک کی پُرانی تاریخ کا سرمایہ ہے۔ خود یہاں کے لوگوں کو نہ تاریخ سے چنداں دلچسپی تھی اور نہ ان کی کتابوں میں بے سروپا افسانوں کے سوا کچھ ملتا ہے۔

سکندر بیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت تک مقدونیہ کو بھی یُونان میں کوئی خاص حیثیت حاصل نہ تھی۔ یُونان اور ایران کے درمیان مُدت سے لڑائیاں جاری تھیں۔ سکندر نے شروع ہی سے ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ ایران کی قوت کو مٹائے بغیر چین نہ لے گا، چنانچہ فوج لے کر نکلا اور درہ دانیال کے پاس سے سمندر کو عبور کر کے ایشیا پہنچ گیا۔ روانگی سے پہلے اپنا سارا مال دوستوں میں بانٹ دیا۔ جب پُوچھا گیا کہ اپنے لیے کیا رکھا تو کہا "اُمید" یہ سُنتے ہی دوستوں نے بھی سب کچھ یہ کہتے ہُوئے لُٹا دیا کہ ہمارے لیے بھی اُمید ہی کافی ہے۔

ایشیائے کوچک، شام، مصر اور ایران کو فتح کر چکا تو سکندر کے دل میں دُنیا بھر کو مسخر کرنے کا جذبہ اُبھرا، چنانچہ ترکستان ہوتا ہوا ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ ہندوستان خدا جانے اس وقت کتنی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ جس علاقے کو ہم پنجاب کہتے ہیں، اس میں کم از کم آٹھ ریاستیں قائم تھیں۔ ان میں سے بعض نے مقابلہ مناسب نہ سمجھا اور بعض نے اطاعت قبول کر لی۔ صرف راجا پورس نے مقابلے کی ٹھان لی۔ وہ دریائے

جہلم اور دریائے چناب کے درمیانی علاقے کا حاکم تھا۔

پورس نے اپنی فوج کے پرے اس طرح جما دیئے تھے کہ سکندر دریائے جہلم کو عبور نہ کر سکے، لیکن وہ لمبا چکّر کاٹ کر دریا کے پار اُتر آیا اور ایسے وقت میں حملہ کر دیا جب پورس کو لڑائی کا سان گمان بھی نہ تھا۔ راجا کی فوج نے شکست فاش کھائی۔ وہ خود لڑتے لڑتے زخموں سے چُور ہو گیا اور یونانیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ سکندر کے سامنے لے گئے تو اس نے پُوچھا "کہو تم سے کیا سلوک کیا جائے"؟ پورس نے بے باکانہ جواب دیا "جیسا سلوک بادشاہ بادشاہوں سے کرتے ہیں"۔ سکندر اس جواب پر بہت خوش ہُوا اور پورس کی پُوری ریاست بحال کر دی، بلکہ اور علاقے بھی اسے دے دیئے۔ پھر سکندر آگے بڑھا۔ بیاس پر پہنچا تو فوج نے پیش قدمی سے انکار کر دیا۔ مجبور ہو کر لوٹا اور بابل پہنچ کر تینتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

سکندر یہاں سے جاتے وقت پورس ہی کو تمام مفتوحہ علاقوں کی نگرانی کے لیے ایک لحاظ سے اپنا نائب بنا گیا تھا۔ پورس نے بھی جیتے جی وفاداری کا حق ادا کیا۔ سکندر کی فتح کا سب سے بڑھ کر قابلِ قدر نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ اور ہندوستان کے درمیان جو پردہ پڑا ہُوا تھا، وہ اُٹھ گیا اور باہم گہرے تعلقات کا دروازہ کُھل گیا۔

حق باطل پر غالب آتا ہے

ہر اچھے نظام سے فائدہ اُٹھانے کی صُورت یہ ہے کہ انسان کے دل میں اس کی اچھائی کا یقین ہو اور وہ خوش دلی سے اس پر عمل بھی کرے۔ اسلام امن وسلامتی کا آخری پیغام، دُنیا اور آخرت کی زندگی کا بہترین نظام تھا۔ اس کے لیے بھی ضروری تھا کہ انسانوں میں یقین اور ایمان کی سچّی رُوح پیدا ہو جائے اور وہ اس پر کاربند رہیں۔ یقین اور ایمان کی رُوح جبر سے پیدا نہیں ہو سکتی، اس لیے اسلام کا بنیادی اصُول یہ قرار دیا گیا ہے کہ دین کے معاملے میں کسی پر جبر نہیں۔ ہدایت اور گمراہی کے راستے سب پر واضح ہو گئے۔ ہر شخص خدا کی دی ہوئی بصیرت سے کام لے کر خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اسے فائدے کی طرف لپکنا چاہیے یا آنکھیں بند کر کے نقصان کے غار میں جا گرنا چاہیے۔

حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے اسلام کی دعوت شروع کی اور لوگ اندھیرے سے روشنی کی طرف آنے لگے تو قریش نے، جنھیں مکّہ ہی میں نہیں، پُورے عرب میں سرداری اور عزّت کا مرتبہ حاصل تھا، اس پیغامِ حق کی مخالفت شروع کر دی۔ وہ زور و قوّت سے کام لے کر غریب و مسکین مسلمانوں کو ظلم و جوَر کا نشانہ بنانے لگے۔ کسی کو تپتی ہوئی دوپہر میں ریت پر لٹا کر سینے پر بھاری پتّھر رکھ دیتے۔ کسی کے گلے میں رسّا باندھ کر بازاروں میں کھینچتے۔ کسی کو دہکتے ہُوئے انگاروں کے فرش پر لیٹ جانے کے لیے مجبُور کرتے۔ تیرہ سال تک مسلمانوں نے ہر قسم کی سختیاں صبر کے ساتھ برداشت کریں، مگر قریش کے طور طریقے نہ بدلے۔ حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم اور آپ کے خاندان کو تین سال تک ایک گھاٹی میں بند رہنا پڑا۔ طائف میں آپ پر پتّھروں کی بارش ہوئی۔ مجبور ہو کر آپ نے ساتھیوں کو مکّہ سے مدینہ جانے کی اجازت دے دی، جہاں کے باشندے مسلمانوں کی مہمانداری کے لیے تیار تھے۔ بعد میں آپ بھی وہیں تشریف لے گئے۔

اب سوچو کہ قریش کو اسلام سے دُشمنی تھی تو مسلمان ان سے اڑھائی تین سو میل شمال میں چلے گئے تھے، پھر ان کا پیچھا کرنے اور انھیں مٹا دینے کے لیے سر و سامان کرنے کی کیا ضرورت تھی، لیکن قریش کے دل میں دشمنی کی آگ بدستور بھڑکتی رہی اور اُنھوں نے مدینے پر یورشیں شروع کر دیں۔ مدینے کے یہودیوں کو ساتھ ملا کر مُسلمانوں کے لیے رہنا سہنا دوبھر بنا دیا۔ آخر مُسلمانوں کو بھی اپنی حفاظت کے لیے قدم اُٹھانا پڑا۔

بدر کے مقام پر مسلمانوں اور قریش کے درمیان ایک زبردست لڑائی ہوئی جسے قرآن مجید میں فیصلے

کادن قرار دیا گیا ہے، اس لیے کہ اس دن حق اور
باطل، نیکی اور بدی، راستی اور کجی، سچ اور جھوٹ
کے درمیان قطعی فیصلہ ہو گیا۔ مسلمان تین سو سے
کچھ زیادہ تھے اور قریش ایک ہزار سے کم نہ تھے۔
پھر مسلمانوں کے پاس جنگ کا ساز و سامان بہت کم
تھا اور قریش کے پاس نہ دولت کی کمی تھی نہ ساز و
سامان کی کمی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ
مسلمان لڑنا نہیں چاہتے تھے اور انھوں نے لڑائی
کے لیے پہل ہرگز نہ کی تھی، البتہ قریش کی دراز
دستیوں کا جواب دینے کے لیے ضرور تیار تھے۔ بدر
کی جنگ بھی اس وجہ سے ہوئی کہ قریش نے تجارت
میں گراں قدر رقم فراہم کر کے مسلمانوں کے خلاف
جنگی تیاریوں کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے
بہت بڑا تجارتی قافلہ شام بھیجا۔ مسلمان اس پر چھاپہ
مارنے میں بالکل حق بجانب تھے۔ ابھی دیکھ بھال
ہی جاری تھی کہ قافلۂ قریش کے سردار نے قاصد
کے ذریعہ مکّہ پیغام بھیج دیا اور قریش کو بلا لیا۔ وہ
خوب تیار ہو کر بڑے کرّ و فر کے ساتھ دو سو میل کا
فاصلہ طے کر کے بدر پہنچ گئے۔ اگرچہ اس وقت تک
قافلہ بچ کر بدر سے آگے نکل گیا تھا اور حملے کا
کوئی خطرہ نہ رہا تھا، مگر قریش نے فیصلہ کر لیا کہ
لڑے بغیر نہ جائیں گے۔ اس طرح جنگ ہوئی،
قریش نے شکست فاش کھائی۔ ان کے بڑے بڑے
سردار مارے گئے یا قید ہو گئے۔

بدر کے مقام پر حق کی فتح و فیروزمندی
کا پھریرا پہلی مرتبہ کھلا تھا۔ پھر یہ زیادہ سے زیادہ
کھلتا اور سربلند ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ سات آٹھ
سال کے اندر پورے عرب کی فضا اس کے سائے
میں آ گئی۔ تھوڑی ہی مدت میں پرانی دنیا کے
تینوں برّاعظم تکبیر کے نعروں سے معمور ہو گئے
اور اوقیانوس سے بحر الکاہل تک ہر خطہ دینِ حق کی
صداؤں سے گونجنے لگا۔

اسلام فتحِ مبین حاصل کرتا ہے

اگرچہ جنگِ بدر نے قریش کا دم خم بُری طرح توڑ کر رکھ دیا تھا لیکن باطل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ چوٹ کھا کر اپنی ہٹ پر اور پکّا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قریش نے بدر کے بعد بھی مسلمانوں پر دو مرتبہ حملے کیے۔ ایک مرتبہ تو وہ مختلف قبیلوں سے ساز باز کر کے اتنا بڑا لشکر لے آئے جتنا عرب کی سرزمین نے کبھی نہ دیکھا تھا، لیکن ہر مرتبہ اُنھیں ناکامی و نامرادی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اس آخری یورش کو جسے "جنگِ خندق" کہتے ہیں، مسلمانوں اور قریش کی کشمکش میں انقلابی نقطے کی حیثیت حاصل ہے، یعنی اس کے بعد سیل کا رُخ پلٹ گیا، گرد و غبار چھٹ گیا اور اسلام کی کامیابی کے سورج سے فضا جگمگا اُٹھی۔

جنگِ بدر ہجرت کے دُوسرے سال ہوئی تھی۔ ہجرت کے چھٹے سال ذی قعد کے مہینے میں (مارچ ۶۲۸ء) حضرت رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کعبے کی زیارت کا ارادہ فرمایا۔ چودہ سو حق پرست آپ کے ہمرکاب تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں سب کو مکّہ شریف آنے کی عام اجازت ہوتی تھی اور لڑائیاں بالکل بند کر دی جاتی تھیں، مگر قریش مسلمانوں کی آمد کو برداشت نہ کر سکے اور مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مکّہ شریف سے تھوڑے فاصلے پر حدیبیہ[1] کے مقام پر ڈیرے ڈال دیئے اور کوشش کی کہ صلح سے معاملہ طے ہو جائے۔ حضرت عثمانؓ کو بات چیت کے لیے قریش کے پاس بھیجا۔ تھوڑی دیر میں افواہ پھیل گئی کہ قریش نے حضرت عثمانؓ کو شہید کر ڈالا۔ یہ جنگ کا اعلان تھا۔ چنانچہ حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر چودہ سو ساتھیوں سے بیعت لی۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ یہ افواہ غلط تھی۔

قریش کو مسلمانوں کے ارادۂ جنگ کی خبر ملی تو ان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی اور انھوں نے صُلح کی بات چیت شروع کر دی۔ غرض دس سال کے لیے صُلح ہو گئی۔ جو شرطیں طے ہوئیں ان میں بظاہر مسلمانوں کا پہلو دبا ہُوا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ اس سال واپس چلے جائیں اور اگلے سال آئیں تو کعبے کی زیارت کا موقع دے دیا جائے گا۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں اور تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں۔ غیر مسلموں میں سے کوئی شخص مدینہ شریف جائے گا تو اسے واپس کر دیا جائے گا۔ کوئی مسلمان مکّہ شریف آئے گا

۱۔ یہ مقام اب چنداں مشہور نہیں اور اس کے پاس کا ایک مقام شمیسی کے نام سے شہرت پا گیا ہے۔

تو اسے واپس نہ کیا جائے گا۔

ان شرطوں پر بعض صحابہؓ کو تعجب ہوا لیکن حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرائط منظور فرمالیں۔ قرآن مجید نے اس صلح کو کھلی ہوئی فتح قرار دیا اور مسلمانوں کو ایک اور قریبی فتح کی خوشخبری بھی دے دی۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی کھلی ہوئی فتح تھی۔ لڑائیاں حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے نہیں، بلکہ قریش نے شروع کی تھیں۔ اسلام دین کے معاملے میں جبر کا روادار نہ تھا۔ قریش نے جبراً لوگوں کو دینِ حق سے روکنے کی کوشش کی اور تیرہ سال تک مکے میں مسلمانوں پر ظلم و جبر کرتے رہے اور جب مسلمان مدینہ شریف چلے گئے تو وہاں بھی چھ سال تک مسلمانوں کو سکھ کا سانس نہ لینے دیا اور یہ یقیناً اسلام کی کھلی ہوئی فتح تھی کہ قریش کم سے کم دس سال کے لیے جبر و ظلم سے دست بردار ہو گئے۔ لڑنے میں ہمیشہ پہل انھوں نے کی، مگر اب خود ہی لڑائی ترک کر رہے تھے۔ اسلام رائے اور عقیدے کی آزادی کا دعوے دار تھا۔ رائے اور عقیدے کی آزادی حدیبیہ کے صلح نامے کی بنیاد تھی۔ اس سے زیادہ روشن اور کھلی ہوئی فتح اور کیا ہو سکتی تھی؟

پھر یہی صلح نامہ تھا جس کی بدولت حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی کشمکش سے فراغت مل گئی اور آپ آزادی اور اطمینان سے اسلام کا پیغام پہنچانے لگے۔ جو قبیلے اور گروہ قریش کے خوف سے اسلام قبول کرنے سے ہچکچاتے تھے، وہ جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے گئے۔ یقیناً یہ "فتح مبین" تھی اور دوسری قریبی فتح جس کی خوشخبری دی گئی تھی، فتح مکہ کی شکل میں رونما ہوئی۔

مکّہ شریف فتح ہوتا ہے

صُلح حُدیبیہ پر تقریباً دو سال گزر چکے تھے۔ اس کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو قبیلے چاہیں مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں اور جو چاہیں قریش کے ساتھی بن جائیں۔ انھیں وہی حقُوق حاصل ہوں گے جو صُلح کرنے والے فریقوں کو حاصل ہیں۔
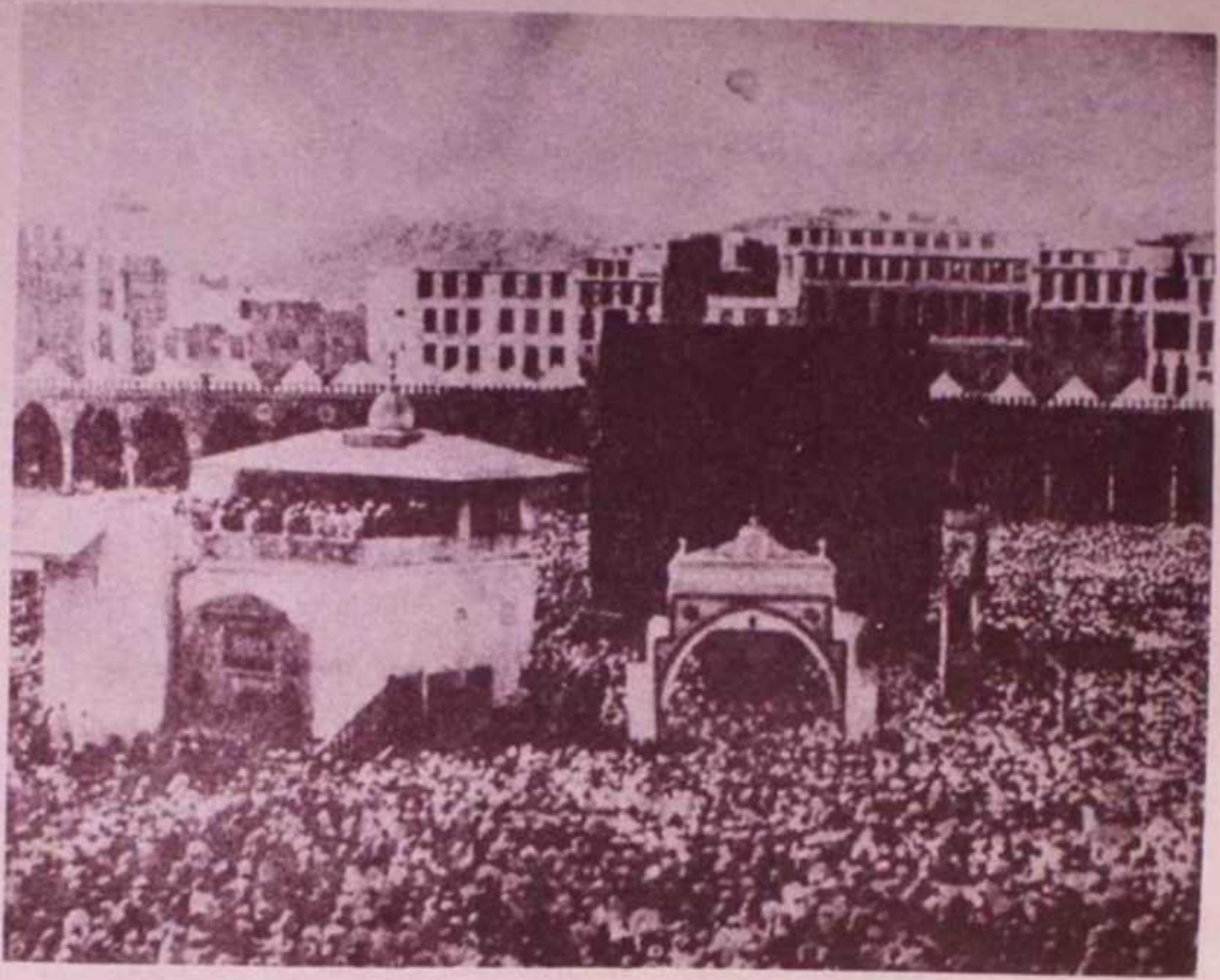
مکّہ معظّمہ کے پاس دو قبیلے آباد تھے جن میں باہم تنازعہ تھا۔ ان میں سے ایک مسلمانوں سے مل گیا اور دُوسرا قریش کا ساتھی بن گیا۔ اچانک قریش کے ساتھی قبیلے نے مسلمانوں کے ساتھی قبیلے پر حملہ کر دیا۔ قریش نے بھی اپنے ساتھیوں کو بڑی مدد دی اور مُسلمانوں کے ساتھیوں پر سخت ظلم کیا، یہاں تک کہ حرم میں بھی اُنھیں امان نہ ملی، جہاں کسی پر اُنگلی تک نہ اُٹھائی جا سکتی تھی۔ یہ دردناک خبر مدینہ منوّرہ پہنچی تو حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ و سلّم نے قریش کے سامنے فیصلے کی تین صُورتیں پیش کیں:-

۱۔ مظلوموں کا جو جانی اور مالی نقصان ہو چکا ہے، اسے پُورا کر دیا جائے۔

۲۔ قریش اپنے ساتھی قبیلے کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں۔
۳۔ یہ اعلان کر دیا جائے کہ حُدیبیہ کا صُلح نامہ باقی نہیں رہا۔

ایک جلد باز نے کہہ دیا کہ ہمیں تیسری شرط منظور ہے۔ یہ سُنتے ہی حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مکّہ شریف کی تیاری شروع کر دی۔ اب دس ہزار جانباز آپ کے ساتھ تھے۔ مکّہ شریف سے چند میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالا۔ دس ہزار آدمی دُور تک پھیل گئے اور رات کو الگ الگ آگ روشن کی تو دیکھنے والوں پر یہ اثر پڑتا تھا کہ فوج کو وہ وادی پر چھائی ہوئی ہے۔

قریش کو جلد اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور ان کے بڑے بڑے سردار دربارِ نبوی میں حاضر ہو ہوکر اسلام قبول کرنے لگے۔ دُوسرے روز آپ نے اعلان فرمادیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے یا اپنے گھر میں بیٹھا رہے یا کعبے میں چلا جائے یا فلاں فلاں قریش سرداروں کے پاس پناہ لے لے، اسے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ اس طرح مکّہ شریف پُرامن طریق پر فتح ہوگیا۔

آپ نے اہلِ مکّہ کو جمع کیا۔ ان میں وہ سب لوگ شامل تھے، جن کی تلواریں اور برچھیاں اکیس سال تک تڑپ تڑپ کر مسلمانوں پر برستی رہی تھیں۔ اس موقع پر آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، وہ نہ کسی فاتح کی زبان سے پہلے سُنا گیا اور نہ بعد میں۔ فرمایا:۔

"ایک خُدا کے سوا کوئی خدا نہیں۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پُورا کیا، اپنے بندے کی مدد کی اور مخالفوں کے تمام منصوبوں کو اکیلے توڑ کر رکھ دیا۔ ہاں سُن لو فخر کی تمام باتیں، مال اور خون کے سارے دعوے میرے قدموں کے نیچے ہیں۔

اے قریش! خدا نے جاہلیت کا غرور اور نسب کا فخر مٹادیا۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹّی سے بنے تھے۔"

ساتھ ہی قرآن مجید کی ایک آیت تلاوت فرمائی، جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"لوگو، ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دُوسرے سے پہچان لیے جاؤ۔ خدا کے نزدیک زیادہ عزّت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔ خُدا دانا اور واقف کار ہے۔"

نسل کے غرور، نسب کے گھمنڈ اور دولت و عزّت کے فخر کو مٹا کر انسانی مساوات کا یہ پہلا پاکیزہ اعلان تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان ہونے کے لحاظ سے عرب و عجم، امیر و غریب، شاہ و گدا، حاکم و محکوم سب برابر ہیں۔ خُدا کے ہاں اُونچ نیچ کا پیمانہ صرف ایک ہے اور وہ ہے عمل، اخلاق اور برتاؤ کی پاکیزگی۔ وہ ہے خدا کے حکموں کی پیروی۔

آخر میں فرمایا:۔
"جانتے ہو میں تم سے آج کیا سلوک کرنے والا ہوں؟"

پھر خود ہی فرمایا:۔
"تم پر آج کچھ الزام نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

یوں قریش کے تمام پچھلے ظلم و جور پر عفو کا خط کھینچ دیا اور سب کو موقع دے دیا کہ ماضی کو بھول کر آیندہ کے لیے اپنا طرزِ عمل درست کریں۔ تاریخ کے تمام دفتر کھنگال ڈالو، عفو و رحمت کی ایسی ایک بھی مثال نہ مل سکے گی۔

دُنیا کو امن و سلامتی کا آخری پیغام ملتا ہے

حضرت رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہجرت کے دسویں سال حج کیا، اس موقع پر کم و بیش ڈیڑھ لاکھ مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے ان کے سامنے ایک سے زیادہ خطبے ارشاد فرمائے۔ ان میں زیادہ تر وہ باتیں تھیں، جو صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پُوری انسانیت کے لیے چراغِ ہدایت تھیں۔ بعض ارشادات یہاں پیش کیے جاتے ہیں:۔

توحید اور انسانی مساوات کی طرف توجّہ دلاتے ہوئے فرمایا:۔

"لوگو، بیشک تمھارا خُدا ایک ہے اور بیشک تمھارا باپ ایک ہے۔ جان لو کہ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔"

بے شک سب کا خُدا ایک ہے۔ وہی پیدا کرتا ہے۔ وہی رزق دیتا ہے۔ وہی عبادت کے لائق ہے۔ اگر ایک باپ کے بیٹوں میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہو سکتا تو آدم کی اولاد اپنے درمیان کیوں فرق کو راہ دے؟ انسانوں کی بڑائی، عمل کی نیکی اور اخلاق کی اچھائی پر موقوف ہے۔ رنگ، نسل، خاندان، قوم، وطن، دولت یا ایسی ہی کوئی دُوسری چیز کسی کو کیوں کر بڑا بنا سکتی ہے؟ دیکھو اس چھوٹے سے ارشاد نے انسانیت کے فکر و نظر میں کتنا بڑا اور بنیادی انقلاب پیدا کر دیا۔ ہر شے سے توجّہ ہٹا کر صرف نیکی اور حُسنِ اخلاق کو انسانوں کا نصب العین بنا دیا۔ کیا اس ایک ارشاد پر کاربند ہو جانے سے انسانیت کے وہ سارے دُکھ دُور نہیں ہو سکتے جو آج شرق و غرب کو پریشان کیے ہُوئے ہیں؟

اجتماعی زندگی اصولاً تین چیزوں پر قائم ہے: جان کی حفاظت، مال کا پاس اور آبرو کا احترام۔ مذہب نے جن باتوں کو گُناہ اور قانون نے جُرم قرار دے رکھا ہے، غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ سب ان تین چیزوں کے سلسلے میں حدیں توڑنے کا نتیجہ ہیں یا ایسے کام ہیں جو انسانوں کو ان حدوں سے بے پروائی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ حضرت رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:۔

"تمھاری جانیں، تمھارے مال اور تمھاری آبروئیں ایک دُوسرے پر قیامت تک کے لیے اس طرح حرام ہیں جس طرح تم آج کے دن (یومِ حج) اس شہر (مکہ شریف) اور

اس مہینے (ماہ حج) کی حرمت کرتے ہو۔"

عربوں میں دو بڑے عیب تھے: ایک یہ کہ کسی کے ہاتھ سے کوئی مارا جاتا تو بدلے کا کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ دوسرا یہ کہ دولتمندوں نے سُود خوری اور مہاجنی کے ذریعے ضرورتمندوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔ حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان دونوں باتوں کو اسلام سے پیشتر کے دَور کی گمراہیاں قرار دیا اور دونوں کو ختم کر دیا۔

پھر مختلف ضروری امُور کی تاکید فرمائی۔ مثلاً:

۱۔ میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دُوسرے کی گردن کاٹنے لگو۔

۲۔ ہر مسلمان دُوسرے کا بھائی ہے اور تمام مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔

۳۔ عورتوں کے معاملے میں خُدا سے ڈرو اور غلاموں کا خیال رکھو۔ جو خود کھاؤ انہیں کھلاؤ جو خود پہنو انھیں پہناؤ۔

۴۔ دین میں حد سے نہ بڑھو۔ تم سے پہلی قومیں حد سے بڑھ جانے ہی کے باعث برباد ہوئیں۔

۵۔ مجرم اپنے جُرم کا خود ذمّہ دار ہے۔ نہ باپ کے جُرم کے لیے بیٹا جواب دہ ہے نہ بیٹے کے جُرم کے لیے باپ۔

۶۔ تم پر ایک نکٹا حبشی بھی امیر بنا دیا جائے اور وہ تمھیں خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کا حکم سُنو اور اس کی فرمانبرداری کرو۔

۷۔ لوگو! نہ میرے بعد کوئی نبی ہے اور نہ تمھارے بعد کوئی اُمّت پیدا ہونے والی ہے۔

خُطبہ ارشاد فرما چکے تو حاضرین سے پُوچھا کہ خُدا کے ہاں تم سے میری نسبت پُوچھا جائے گا تو کیا کہو گے؟ سب نے بیک وقت کہا کہ ہم کہیں گے آپ نے خُدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔ یہ جواب سُن کر آپ نے آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھائی اور تین بار فرمایا۔ اے خدا! گواہ رہنا۔

اس طرح انسانیت کو خُدا کا پیغام پہنچایا جا چُکا تو تقریباً تین ماہ بعد خدائے پاک کا آخری رسول دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس پر ہمیشہ ہمیشہ درود اور سلام ہو۔
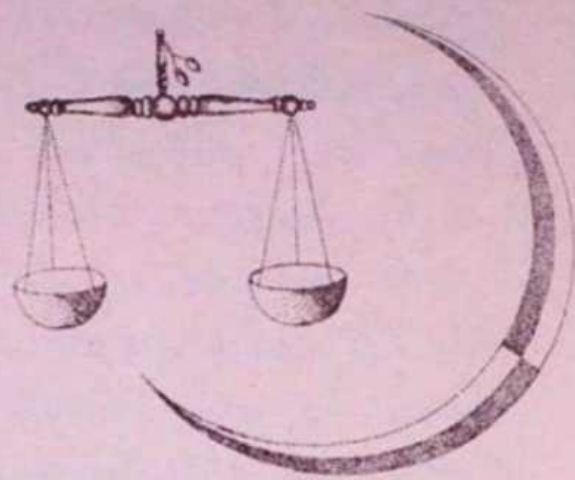
عدل کی بُنیاد اُستوار ہوتی ہے

اِسلام کا اِبتدائی دور اور حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ حجاز کے شمال میں عربوں کے ایک خاندان بنی غسان نے ایک سلطنت قائم کر لی تھی۔ شام میں رومیوں کا اقتدار قائم ہوا تو یہ غسانی سلطنت ان کے زیرِ اثر آگئی تھی۔ جبلہ اس کا آخری تاجدار تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ عرب کے تمام قبیلے اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے ہیں اور نئی اسلامی حکومت نے رُوم و ایران کی شوکت پر بھی لرزہ طاری کر دیا ہے تو وہ خود بھی اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا اور حضرت عمرؓ کو اپنے ارادے کی اطلاع دے دی کہ مدینہ منورہ میں حاضر ہو کر اسلام لانا چاہتا ہوں۔ حضرت عمرؓ یہ اطلاع پاکر بہت خوش ہُوئے اور فرمایا کہ بہت شوق سے آؤ۔ قبولِ اسلام کے بعد تمھیں وہ تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے جو ہمیں حاصل ہیں اور تمھارے ذمّے وہی فرض عائد ہو جائیں گے جو ہم پر عائد ہیں۔

جبلہ پانسو سواروں کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچا۔ اس نے تمام سواروں کو زربفت کی قبائیں پہنا رکھی تھیں۔ خود بھی زرتار لباس زیب بدن کر رکھا تھا اور سر پر مرصّع سنہرا تاج جگمگا رہا تھا۔ اہل مدینہ نے اس ٹھاٹھ کا جلوس کبھی نہ دیکھا تھا۔

غرض جبلہ حضرت عمرؓ کے دستِ مبارک پر اسلام لایا۔ حج کا موسم قریب تھا اور حضرت عمرؓ ہی کے ساتھ حج کے لیے مکّہ معظمہ پہنچا۔ ایک روز خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ اتّفاق سے ایک بدوی کا پاؤں نادانستہ جبلہ کے ڈھیلے ڈھالے لباس پر پڑ گیا۔ جبلہ کے دماغ سے شاہی غرور ابھی زائل نہ ہوُا تھا، اس نے بدوی کے منہ پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ ناک کا بانسہ پھُوٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ بدوی نے جبلہ سے تو کچھ نہ کہا اور داد خواہی کے لیے حضرت عمرؓ کے پاس پہنچ گیا۔

خلیفۂ اسلام نے شکایت سُن کر جبلہ کے پاس آدمی بھیجا اور دریافت کیا کہ اس بے گناہ کو کیوں مارا ہے؟ جبلہ نے جواب دیا کہ اس نے سخت گستاخی کی۔ میرے لباس پر پاؤں رکھ دیا۔ یہ تو طمانچہ ہی تھا، اگر خانۂ خُدا کی حرمت کا پاس نہ ہوتا تو اس کا سر اُڑا دیا جاتا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خیر اَور جو کچھ آپ کرتے وہ تو دیکھ لیا جاتا، آپ نے اپنے جُرم کا اِقبال تو کر ہی لیا، جس طرح بھی ہو اس بدوی کو راضی کیجئے، ورنہ مجھے حکم دینا پڑے گا کہ بدوی بھی آپ کے مُنہ پر اسی طرح طمانچہ رسید کرے۔

جبلہ یہ سُن کر حیران رہ گیا اور بولا کہ میں فرمانروا ہوں اور یہ ادنیٰ شخص! میں تو سمجھتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے میری عزت بڑھے گی۔ یہ کب خیال تھا کہ جو عزت پہلے سے حاصل ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، اسلام نے تمہیں اور اس شخص کو برابر کر دیا ہے۔ فضیلت میں بڑا وہ ہے جو نیک عملی میں بڑا ہو۔ تمہاری عزت یقیناً بڑھ گئی، وہ اس طرح کہ تم میں اور تمام مسلمانوں میں اخوت و برادری کا رشتہ پیدا ہو گیا۔

آخر جبلہ نے ایک رات سوچنے کی مہلت مانگی۔ اندھیرا چھا گیا تو وہ اپنے سواروں کو لے کر چُپ چاپ نکل گیا۔ وہ اپنے وطن میں بھی نہ ٹھہرا، بلکہ رُومی بادشاہوں کے مرکز میں جا پہنچا اور باقی زندگی بڑے عیش و آرام سے بسر کی، لیکن آخری وقت تک اسلام سے پھر جانے پر پچھتاتا رہا۔ وہ خود کہتا کہ کاش میری ماں مجھے نہ جنتی اور کاش میں وہ بات مان لیتا جو حضرت عمرؓ نے فرمائی تھی۔

دیکھو حضرت عمرؓ نے چھوٹے بڑے کا لحاظ کیے بغیر سلطانِ عدل کا فیصلہ سُنا دیا اور جبلہ کی خاطر اصُول میں ردّ و بدل گوارا نہ کیا۔ حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا تھا کہ پہلی قومیں اس لیے ہلاک ہوئیں کہ غریبوں پر شریعت کا حکم لگا دیا جاتا تھا اور امیروں سے کچھ نہ کہا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ہلاک ہونے والی قوموں کا طریقہ اِختیار نہ کیا۔

ساسانی شاہنشاہی دُنیا سے مِٹتی ہے

ہمت بلند ہو اور یقین کامل کہ جس مقصد کو لے کر اُٹھے ہیں وہ ہر لحاظ سے درست ہے تو معمولی سامان سے بھی بڑی بڑی طاقتوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ عرب خدا کا پیغام لے کر اُٹھے تھے، تو ان سے بڑھ کر بے سروسامان کوئی قوم نہ تھی۔ شروع ہی میں انھیں دُنیا کی دو بڑی شاہنشاہیوں سے مقابلہ پیش آیا تھا۔ ایک رُومی شاہنشاہی اور دُوسری ساسانی شاہنشاہی عربوں نے بے سامانی کے باوجود ان دو شاہنشاہیوں کو اس طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیا، گویا وہ مٹی کے بُت تھے اور ان میں زندہ رہنے کا کوئی بھی جوہر موجود نہ تھا۔

عربوں اور ساسانیوں کے درمیان پہلی بڑی لڑائی قادسیہ کے میدان میں ہوئی۔ اسی نے ساسانی سلطنت کی قسمت پر قضا و قدر کی آخری مہر لگا دی۔ یہ لڑائی چار دن جاری رہی۔ ساسانیوں کو اپنے جنگی ہاتھیوں کی قطاروں پر بڑا بھروسا تھا۔ ہاتھی آگے بڑھتے تھے تو عربوں کے گھوڑے ان متحرک چٹانوں کو دیکھ کر بدکتے اور پیچھے کی طرف بھاگ نکلتے تھے۔ عربی لشکر کے سپہ سالار کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہاتھیوں کی بلا سے نجات نہ ہو گی کامیابی کی کوئی اُمید نہ رکھنی چاہیئے۔ چنانچہ اس نے من چلے جوانوں کی ایک جماعت کے ذمّے یہ کام لگا دیا کہ ہاتھیوں کی آنکھوں میں نیزے ماریں اور ان کی سُونڈیں کاٹ دیں۔ یہ جوان گھوڑوں سے اُتر کر ہاتھیوں پر پل پڑے۔ اُنھوں نے تاک تاک کر ہاتھیوں کی آنکھوں میں نیزے مارے اور ساتھ ہی چابک دستی سے ان کی سُونڈیں اُڑا دیں۔ ہاتھی چنگھاڑتے ہوئے پیچھے کی طرف بھاگے اور ساسانی لشکر کو روندتے ہوئے نکل گئے۔

ساسانی سپہ سالار نے اپنی سپاہ کو للکار کر کہا: "دیکھو تمھارے دشمن کتنی جانبازی دکھا رہے ہیں، حالانکہ وہ ایک بھوکی ننگی قوم کے سپاہی ہیں اور ان کو بہادری کا کوئی صلہ ملنے کی اُمید نہیں۔ تم ایک عظیم الشان سلطنت کے سپاہی ہو۔ تمھارے بادشاہ نے سونے چاندی سے لدے ہوئے خچر بھیج دیئے ہیں۔ تم میں سے جو شخص بہادری کا کارنامہ دکھائے گا، اسے مالا مال کر دیا جائے گا۔" لیکن یہ للکار بے نتیجہ رہی۔ انعام اور عہدے کا لالچ ان لوگوں کے مقابلے میں کیا کام دے سکتا تھا جن کی تلواریں صرف حق اور انصاف کی خاطر بلند ہوئی تھیں؟ جو دُنیا کی ہر شے کو ٹھکرا چکے تھے اور خدا کی راہ میں موت اُنھیں زندگی سے بڑھ کر عزیز تھی۔

ساسانیوں نے رات کے وقت چھاپا مارنے کی تیاری کی۔ عربوں نے اُونٹوں کی ایک قطار تیار کی جن پر خشک گھاس کے گٹھے مضبوط باندھ کر لاد دیے پھر ان گٹھوں کو آگ لگا کر اونٹوں کو ساسانی لشکر کی طرف دَوڑا دیا۔ آگ کی اس دیوار نے جدھر کا رُخ کیا ساسانیوں کے گھوڑے باگیں تڑا تڑا کر بھاگ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سارا ساسانی لشکر ریت کے ذرّوں کی طرح بکھر گیا۔

اس شکست کے بعد ساسانی کہیں بھی نہ ٹھہر سکے۔ چند سال میں پُوری ساسانی سلطنت عربوں کے قبضے میں آ گئی اور اسلامی فتوحات کا سیل ایک طرف دیوارِ چین کے ساتھ ٹکرانے لگا اور دُوسری طرف اس کی لہریں اوقیانوس تک پہنچ گئیں۔
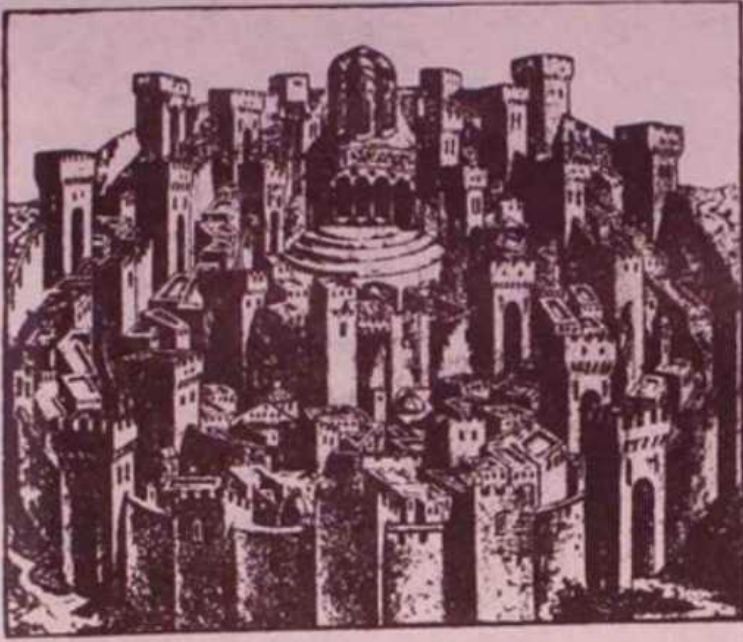
بیتُ المقدس اسلامی خلافت کی پناہ میں آتا ہے

خُدا نے ہمیں جو عزت دی ہے، وہ اسلام کی عزّت ہے اور ہمارے لیے یہی بس ہے۔" یہ الفاظ حضرت عمر فاروق رضؓ نے اس وقت فرمائے جب بیتُ المقدس کے سفر میں عرب سواران کی سواری کے لیے ترکی گھوڑا اور پہننے کے لیے عمدہ قیمتی پوشاک لائے۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ انسان کا رُعب داب اور جلال و شکوہ، زرق برق لباس یا اچھی سواری پر موقوف ہے۔ حضرت عمر رضؓ کے نزدیک انسان کی ساری عظمت اس کی سیرت اور فضائل اخلاق میں تھی اور اس میں تھی کہ پُوری زندگی خدا کی رضا کے مطابق بسر کی جائے اور اس کے بندوں کی خدمت کا حق ادا کیا جائے۔

عرب فوجیں شام اور فلسطین کے اکثر شہر فتح کر چُکی تھیں اور وہ بیت المقدس کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں۔ محصورین کو جب باہر سے کسی امداد کی اُمید باقی نہ رہی تو انھوں نے صلح کی درخواست پیش کر دی، لیکن یہ شرط لگائی کہ خلیفہ خود آئیں اور ان کے ہاتھوں سے عہد نامۂ صلح لکھا جائے۔

حضرت ابوعبیدہ رضؓ عرب فوجوں کے سالارِ اعظم تھے۔ اُنھوں نے بیت المقدس والوں کی شرط کے متعلّق دربارِ خلافت میں اطلاع دی تو حضرت عمر رضؓ صحابہ کے مشورے سے رجب ١٦ھ (اگست ٦٣٧ء) میں مدینہ منوّرہ سے روانہ ہُوئے۔ جانتے ہو اس فرمانروا کا سامان سفر کیا تھا، جس کی فوجیں ساسانی و رُومی شاہنشاہوں کو ہر میدان میں شکست دے چُکی تھیں؟ نہ نقارہ و نوبت، نہ لاؤ لشکر نہ کوئی ڈیرہ اور خیمہ۔ سواری میں ایک گھوڑا تھا اور چند مہاجرین و انصار ہمراہ تھے۔ سفر کا پُورا سامان جس میں رسد بھی شامل تھی، ایک اُونٹ پر لدا ہُوا تھا۔

یرموک کے شمال میں جابیہ ایک مقام تھا، سالاروں نے وہاں پہنچ کر ملاقات کی اور تمام حالات سُنائے۔ وہیں بیت المقدس کے نمائندوں سے صلح کی شرطیں طے ہوئیں۔ عہد نامے پر دستخط ہو جانے کے بعد حضرت عمر رضؓ نے بیتُ المقدس کا قصد کیا۔ آپ کی

سواری میں جو گھوڑا تھا اس کے سُم گھس کر خراب ہو گئے تھے اور وہ رُک رُک کر چلتا تھا۔ سواری کے لیے دُوسرا گھوڑا پیش کیا گیا جو شوخ اور چالاک تھا۔ وہ کلیلیں کرنے لگا۔ حضرت عمرؓ یہ کہتے ہُوئے اُتر پڑے کہ کم بخت یہ مزودی کی چال تو نے کہاں سے سیکھی اور پیادہ پا چل پڑے۔ بیت المقدس میں وہ تمام مقامات دیکھے جو مقدس مانے جاتے تھے۔ عیسائیوں کا بڑا گرجا بھی دیکھا۔ نماز کا وقت آیا تو اگرچہ عیسائی کہتے ہی رہے کہ گرجے میں نماز ادا کر لی جائے، حضرت عمرؓ نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ مبادا مسلمان میرے اس عمل کو حجت بنا کر کل گرجوں میں نمازیں ادا کرنے لگیں۔

بیت المقدس کے باشندوں کو جو عہد نامہ لکھ کر دیا تھا وہ اس لیے یہاں درج کیا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت کے ماتحت غیر مسلموں کے حقوق کی یہ ایک نہایت اہم تاریخی دستاویز ہے۔

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے بندے امیرالمومنین عمرؓ نے ایلیا کے لوگوں کو دی۔ یہ امان جان، مال، گرجا صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام ہم مذہبوں کے لیے ہے۔ نہ ان کے گرجوں میں سکونت کی جائے گی، نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ ان کے احاطوں کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور مالوں میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر ہرگز جبر نہ کیا جائے گا اور نہ ان میں سے کسی کو گزند کا ہدف بنایا جائے گا۔ ایلیا والوں کا فرض ہے کہ وہ دُوسرے شہروں کے باشندوں کی طرح جزیہ دیں اور رُومیوں کو نکال دیں۔ رُومیوں میں سے جو شخص نکل جائے گا، اس کی جان اور مال کو امن ہے، تاآنکہ وہ جائے پناہ میں پہنچ جائے۔ جو رُومی ایلیا میں رہنا اختیار کرے، اُسے بھی امن ہے، البتہ اسے جزیہ دینا ہو گا۔ ایلیا والوں میں سے جو لوگ اپنے مال لے کر رُومیوں کے ساتھ چلے جانا چاہیں تو انھیں اور ان کے گرجاؤں اور صلیبوں کو بھی امان ہے تاآنکہ وہ جائے پناہ میں پہنچ جائیں۔ جو کچھ اس عہد نامے میں لکھا ہے، اس پر اللہ، اس کے رسُول، خلفاؑ اور تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔"

قیصر شام
سے
رخصت ہوتا ہے

"الوداع اے شام! تو کتنا اچھا ملک ہے جسے دشمن کے حوالے کرنا پڑا ہے" یہ الفاظ مشرقی رومی سلطنت کے شہنشاہ نے اس وقت کہے تھے، جب یرموک کی لڑائی میں اسے شکست فاش ہو چکی تھی اور صاف نظر آ رہا تھا کہ کم از کم شام کا علاقہ ضرور چھوڑنا پڑیگا۔

جنگ یرموک دنیا کی چند فیصلہ کن لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے۔ عربوں کے عروج اور رومیوں کے زوال میں اسے سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ عرب دمشق کو فتح کر لینے کے بعد تیزی سے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ اس اثنا میں رومی شاہنشاہ نے فوجیں جمع کرنے کے لیے عام حکم دے دیا اور تھوڑی ہی دیر میں فوجوں کا طوفان اُمنڈ آیا جن کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان کے مقابلے میں عرب تیس پینتیس ہزار ہوں گے اور وہ بھی مختلف محاذوں پر بکھرے ہوئے۔ اس حالت میں دانشمندی کا تقاضا یہی تھا کہ تمام سالاروں کو پیچھے ہٹ کر ایک موزوں مقام پر جمع ہو جانے کا حکم دیا جائے، تاکہ وہ متحد ہو کر لڑ سکیں اور دشمن کے علاقوں میں جا بجا محصور نہ ہو جائیں۔ اس غرض سے دریائے یرموک کا کنارا مناسب سمجھا گیا۔ یہ دریا اُردن کی پہاڑیوں سے نکل کر بحیرۂ طبریہ کے نیچے دریائے اُردن میں مل جاتا ہے اور آج کل شرق اُردن میں واقع ہے۔

عربوں نے جن جن مفتوحہ علاقوں سے خراج کی رقم وصول کی تھی اور وہ کئی لاکھ کی تھی، پوری کی پوری مقامی لوگوں کو اس لیے واپس کر دی کہ وہ حفاظت کی غرض سے لی گئی تھی اور اب عرب جنگی حالات سے مجبور ہو کر پیچھے ہٹ رہے تھے اور حفاظت کا فرض انجام نہ دے سکتے تھے۔ اس واقعے کا اثر اہل شام پر یہ ہوا کہ وہ لوگ رو رہے تھے اور عربوں کی فتح کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ ایک شہر کے یہودیوں نے تو توریت پر حلف اُٹھایا کہ جب تک ہم زندہ ہیں رومی ہمارے شہر پر قبضہ نہیں کر سکتے۔

عربوں کی فوج اگرچہ کم تھی، مگر رومیوں کو ان کی جانبازی کا پورا اندازہ تھا، اس لیے انھوں نے کوشش کی کہ عرب صلح پر راضی ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت خالدؓ کے سامنے تجویز پیش کی کہ سپہ سالار کو دس ہزار دینار، افسروں کو ایک ایک ہزار دینار، اور سپاہیوں کو ایک ایک سو دینار دے دیئے جائیں گے، عرب واپس چلے جائیں۔ حضرت خالدؓ نے انکار کر دیا اور کہا جو اسلام قبول کر لے وہ ہمارا بھائی ہے۔ اگر یہ منظور نہ ہو تو جزیہ دینے کا اقرار کر لو ہم حمایت و حفاظت کا عہد اُٹھالیں گے۔ یہ بھی منظور نہ ہو تو لڑائی کے سوا چارہ نہیں۔

رومی فوج بہت زیادہ تھی اور جوش کا یہ عالم تھا کہ تیس ہزار آدمیوں نے پاؤں میں بیڑیاں پہن لی تھیں، تاکہ ہٹنا چاہیں بھی تو ہٹ نہ سکیں۔ لڑائی بڑی سخت ہوئی۔ کئی مرتبہ عربوں کے مختلف لشکروں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ آخر رومی ستر ہزار جانوں کا نقصان اُٹھا کر بھاگ نکلے۔ عربوں میں سے صرف تین ہزار شہید ہوئے۔

اس کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں شام کے تمام شہر عربوں کے قبضے میں آ گئے اور رومی ہمیشہ کے لیے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اتنے تھوڑے عرصے میں شام و فلسطین جیسے اہم علاقوں کی تسخیر نے دنیا بھر میں عربوں کی دھاک بٹھا دی اور خود وہ بھی پورے اعتماد سے اپنی تقدیر کی شاہراہ پر گامزن ہو گئے۔

سندھ میں اسلام کا پہلا قدم پہنچتا ہے

"تمہیں اپنی فوج، سازوسامان اور ہاتھیوں پر ناز ہوگا، ہمارا بھروسہ صرف خدا پر ہے۔ ہار جیت اسی کے ہاتھ میں ہے۔" یہ اس خط کا ایک حصّہ تھا جو نوجوان سپہ سالار محمد بن قاسم نے سندھ کے راجا داہر کو بھیجا۔ یہی محمد بن قاسم تھا جسے پانچ ہزار بہادروں کے ساتھ اس غرض سے سندھ بھیجا گیا تھا کہ داہر کو مسلمانوں کے جہازوں پر حملہ کرنے کی سزا دے اور جن نہتّے لوگوں کو قید کر رکھا ہے اُنھیں رہائی دلائے۔ اس وقت محمّد بن قاسم کی عُمر سترہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ تاریخ اسلام کے معجزوں میں سے ایک معجزہ محمد بن قاسم بھی تھا۔

نوجوان سپہ سالار نے سندھ پہنچتے ہی سب سے پہلے دیبل کو فتح کیا، جہاں جہازوں پر حملہ ہوا تھا اور قیدیوں کو چھڑایا۔ پھر تھوڑے ہی عرصے میں دریائے سندھ کے مغرب کا پُورا علاقہ مسخر کر لیا۔ راجا داہر کی فوج دریا کے مشرقی جانب بالکل محفوظ موجود تھی اور اس کے سامنے ہوتے ہُوئے دریا کو عبور کرنا آسان نہ تھا۔ محمد بن قاسم نے مغربی کنارے پہ دریا کے پاٹ کے برابر کشتیاں جمع کیں اور انھیں لمبائی میں ایک دُوسرے کے ساتھ بندھوا دیا۔ پھر ان میں ایسے تیرانداز بٹھا دیئے جن کے نشانے کبھی خطا نہ ہوتے تھے۔ کشتیوں کے ایک سرے کو مضبوط رسّوں سے کنارے پر بندھوا دیا اور دوسرے سرے کو دریا میں دھکیل دیا۔ یہ پانی کے دھارے میں پہنچا تو خود بخود دُوسرے کنارے پر جا لگا۔ اگلی کشتیوں کے تیرانداز بجلی کی سی تیزی سے اُترے اور کنارے پر مورچے بنا کر بیٹھ گئے۔ باقی لوگوں نے اگلے سرے کو دوسرے کنارے پر کس کر باندھ دیا۔ یُوں پُل بن گیا جس سے پُوری فوج صحیح سلامت دُوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔

یہاں داہر اور محمد بن قاسم کے درمیان ایک فیصلہ کُن لڑائی ہوئی جو دس روز جاری رہی۔ محمد بن قاسم کے ساتھ صرف بارہ ہزار فوج تھی اور وہ اپنے

مرکز سے بہت دُور اجنبی ملک میں لڑ رہا تھا۔ داہر کے ساتھ ساٹھ ہزار جنگ جُو تھے اور وہ اپنے وطن میں تھا، جہاں اسے ہر قسم کی امداد مل سکتی تھی۔ دسویں دن ۲۰ رجون ۷۱۲ء (۱۰ رمضان ۹۳ھ) کو غروب آفتاب کے وقت داہر مارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سندھ کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا اور ہندوستان میں پہلی اسلامی حکومت کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔

محمد بن قاسم نے فتح کے بعد ملک کا انتظام اس خُوبی سے کیا کہ پُورا سندھ اس کے گیت گانے لگا۔ پنڈتوں اور پروہتوں کو سرکاری خزانے سے جو رقمیں مندروں کی دیکھ بھال کے لیے ملتی تھیں، بدستور جاری رکھیں۔ عام محکمے سندھیوں ہی کے ہاتھ میں رہے، البتہ نگرانی کے لیے جا بجا مسلمان افسر مقرر کر دیئے۔ غریب کسانوں کی حالت خراب تھی، ان کے لیے زیادہ آرام و اطمینان کا بندوبست ہوگیا۔ جاٹوں کے ساتھ بُرا سلوک ہوتا تھا۔ اُنھیں جوتا پہننے یا زین ڈال کر گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت نہ تھی۔ محمدؒ نے ایسے تمام قاعدے منسوخ کر دیئے جو مختلف طبقوں میں امتیاز پیدا کرتے تھے۔ سندھی اتنے خوش ہُوئے کہ ایک شہر کے لوگوں نے محمد کی مُورتی بنا کر مندر میں رکھی اور دوسری مورتیوں کے ساتھ اس کی بھی پُوجا کرنے لگے۔ یہ ایسا اعزاز ہے جو محمد بن قاسم کے سوا کسی دُوسرے مسلمان سالار کو نہ مل سکا۔

غور فرمائیے کہ ہمارے زمانے کا سترہ سال کا نوجوان درسگاہوں کی تعلیم بھی مکمل نہیں کر سکتا۔ محمد بن قاسم نے اتنی عمر میں سالاری کے گُر بھی سیکھ لیے تھے، بلکہ اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ اسے تسخیرِ سندھ جیسی مشکل مہم پر بہ طور سالار بھیجتے وقت کسی کو تامّل نہ ہُوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب کو یقین تھا کہ محمد بن قاسم اس مہم کی ذمّہ داری کے تقاضے بہتر سے بہتر طریق پر پُورے کر سکتا ہے۔ اس نے ملک اس تیزی اور جوانمردی سے مسخر کیا کہ بڑے بڑے سالاروں کے لیے بھی اس پر رشک بجا ہے۔ پھر ملک کا انتظام اس خُوبی سے کیا کہ اس کی مثالیں تاریخ میں آسانی سے نہیں مل سکتیں۔ اسے صرف تین چار سال کی مہلت ملی۔ اکیس بائیس برس کی عمر میں اس نے وفات پائی اور اپنے پیچھے ایسا نام چھوڑ گیا جو مسلمانوں کے لیے تیرہ سو سال سے باعثِ فخر اور دوسروں کے لیے باعثِ عزّت چلا آتا ہے۔

نقشہ افریقہ

بحرِ ظلمات میں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

"اے خدا! اگر سمندر بیچ میں نہ آجاتا اور زمین ختم نہ ہو جاتی تو میں برابر فتح کے پھریرے اُڑاتا اور تیری توحید کے نعرے بلند کرتا چلا جاتا۔" یہ الفاظ تھے جو عقبہ بن نافع نے اس وقت کہے جب وہ شمالی و مغربی افریقہ کو فتح کرتا ہوا اوقیانوس کے کنارے پر جا پہنچا اور اس نے بے اختیار گھوڑا سمندر میں ڈال دیا، لیکن موجوں نے آگے نہ بڑھنے دیا۔ یہی وہ سمندر تھا جسے پرانے زمانے میں غالباً اس لیے بحرِ ظلمات کہا جاتا تھا کہ کوئی نہ جانتا تھا اس سمندر کے آگے کیا ہے۔ عقبہ بن نافع اسلام کے ابتدائی دور کا نامور فاتح اور بڑا با تدبیر سپہ سالار تھا۔

شمالی افریقہ میں مصر حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں فتح ہو چکا تھا۔ اس کے بعد عربوں نے لیبیا پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے آگے بربر آباد تھے جن کے ساتھ سخت لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ حضرت امیر معاویہؓ نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تو عقبہ کو منتخب کیا کہ وہ بربروں کا خرخشہ مٹا دے اور اسلامی حکومت کے مغربی حصے میں امن و امان قائم کرے۔

عقبہ نے سب سے پہلے تونس میں ایک مناسب مقام تجویز کر کے ایک چھاؤنی قائم کر دی، جسے فوجی مرکز بنا کر آگے قدم بڑھانا تھا۔ بعد میں وہاں شہر آباد ہو گیا، جس نے قیرواں کے نام سے عالمگیر شہرت پائی۔ عقبہ نے نئے مرکز سے پیش قدمی شروع کی تو بربر کہیں مقابلہ نہ کر سکے۔ عقبہ شہروں پر شہر فتح کرتا ہوا شمالی افریقہ کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ وہیں اس نے وہ الفاظ کہے تھے جن سے تاریخ کا ایوان ہمیشہ گونجتا رہے گا۔ علامہ اقبالؒ نے "شکوے" میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ؎

"دشت تو دشت ہیں، صحرا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے"

۶۸۳ء میں بربروں کے ایک سردار نے جو بظاہر مسلمان ہو چکا تھا، دھوکے سے عقبہ کو الجزائر کے مشہور مقام بسکرہ میں شہید کرا دیا، مگر اس نے نوکِ شمشیر سے جن خطّوں پر نقش قائم کر دیئے تھے، وہ ہمیشہ کے لیے اسلام کی مایۂ ناز دولت بن گئے اور عقبہ کا مشہد شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی قومی زیارت گاہ ہے۔

ہسپانیہ کی تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے

۲۴ جولائی ۷۱۱ء (۳ شوال ۹۲ھ) کو ہسپانیہ میں دریائے برباط کے کنارے جو لڑائی ہوئی اس میں ایک طرف گیارہ بارہ ہزار اسلامی فوج تھی جس کا سالار طارق ابن زیاد تھا، دُوسری طرف ہسپانیہ کا بادشاہ راڈرک تھا، جس کی فوج نوّے ہزار سے کم نہ تھی۔ راڈرک نے شکست کھائی اور مارا گیا۔ ہسپانیہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا، جہاں اُنھوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ یہی حکومت تھی جس نے صدیوں تک یورپ میں علم و حکمت اور تہذیب و دانش کا چراغ روشن رکھا۔ اسی چراغ کی لو سے یورپ کے اندھیرے میں اُجالے کا سامان ہوا۔

مسلمان شمالی افریقہ پر قابض ہو چکے تھے اور ہسپانیہ ان کے سامنے تھا۔ وہاں ایک طرف تاج و تخت کے جھگڑے شروع تھے، دُوسری طرف راڈرک کے ظلم و جور نے عوام کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ لوگ بار بار مسلمانوں سے امداد کی درخواستیں کر رہے تھے۔ آخر شمالی افریقہ کے حاکم نے طارق ابن زیاد کو پانچ ہزار فوج دے کر ہسپانیہ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ اس کے پاس صرف چار جہاز تھے۔ جب پوری سپاہ اس مقام پر اُتر گئی جو بعد میں طارق کے نام پر جبل طارق مشہور ہوا تو اس نے جہازوں کو جلوا دیا۔ جب پُوچھا گیا کہ ایسا کیوں کیا اور شریعت میں ترکِ اسباب کب جائز ہے! تو طارق نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ "ہر ملک، ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست۔" یعنی ہر ملک ہمارا ہے، اس لیے کہ ہمارے خُدا کا ہے۔

برباط کے کنارے دو دن فریقین لڑتے رہے، مگر کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ تیسرے دن نماز کے بعد طارق نے ایک ولولہ افروز تقریر کی اور کہا: بھائیو! تم بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو؟ اپنی حالت کا اندازہ کرو، طاقتور دشمن سے مقابلہ ہے جو طوفانی سمندر کی لہروں کی طرح تمھیں گھیر سکتا ہے۔ اس کے پاس ہر قسم کا سامانِ جنگ موجود ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں بھی کم نہیں۔ تمھارے پاس تلواروں اور نیزوں کے سوا کیا ہے؟ لیکن یقین رکھو کہ فتح ہماری ہے۔ یہ لوگ ہماری تلواروں کی کاٹ کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے۔ خدا کے حکموں پر چلو گے اور دین کا جھنڈا اس سرزمین میں گاڑ دو گے تو خدا کی بارگاہ سے تمھیں بہت بڑا انعام ملے گا۔ خدا تعالےٰ تمھیں دُنیا اور آخرت میں سُرخروئی بخشے گا۔

پھر خود سب سے پہلے آگے بڑھ کر حملہ کیا۔ اسی روز جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی مُدت میں پُورا ہسپانیہ مسلمانوں کے زیرِ نگین آگیا۔

بے وطن شہزادہ سلطنت پیدا کرتا ہے

عربوں کے ہاتھوں ہسپانیہ کی تسخیر کا آغاز ۷۱۱ء میں ہوا، لیکن وہاں عربوں کی مستقل سلطنت کا سنگِ بنیاد عبدالرحمٰن نے ۷۵۶ء میں رکھا جو دمشق کے اُموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا پوتا تھا۔

عبدالرحمان پانچ برس کا تھا جب اس کے باپ معاویہ نے وفات پائی۔ دادا نے یتیم پوتے کو محبّت اور ناز و نعمت سے پالا۔ چونکہ اُسے ولی عہد بنانا چاہتا تھا، اس لیے بڑی اعلیٰ تعلیم دلائی۔ وہ بیس برس کا ہوا تو خاندان کے اقبال کا سُورج ڈوب گیا، حکومت عبّاسیوں کے قبضے میں چلی گئی۔ اُموی خاندان کے بہت سے لوگ مارے گئے۔ عبدالرحمٰن جان بچا کر شام سے نِکلا تو خوفناک حالات کے طوفان سے گزرتا ہوًا مراکش جا پہنچا۔ کوئی سامان پاس نہ تھا۔ ایک وفادار غلام کے سوا کوئی آدمی ساتھ نہ تھا، لیکن جوانمردی اور عالی ہمتی کا یہ عالم تھا کہ نظر تاج و تخت کے سوا کسی چیز پر نہ جمتی تھی۔

ایک معمولی کشتی میں سوار ہو کر مراکش سے ہسپانیہ پہنچا۔ وہاں کچھ لوگ اُموی خاندان کے اس شہزادے کا نام سُن کر ساتھ ہو گئے، لیکن حکومت کے مرکز قرطبہ کا حاکم حوالگی پر راضی نہ ہوًا اور مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ عبدالرحمٰن نے بڑی بے سروسامانی کی حالت میں اسے شکست دی۔ پھر سارے اسلامی علاقوں کو ایک مرکز کے ماتحت لا کر اس بادشاہی کی بنیاد رکھی جو ساڑھے تین سو سال تک قائم رہی۔ یورپ اس کی ہیبت سے لرزتا تھا۔ اس عہد میں جو عمارتیں بنیں اُن کی نظیر کوئی دُوسرا ملک آج تک پیش نہ کر سکا۔ ان میں سے صرف ایک مسجد باقی ہے۔ اگرچہ اس کی پُرانی شان و شوکت ماند پڑ چکی ہے، تاہم اب بھی وہ دُنیا کی عبادت گاہوں میں یگانہ مانی جاتی ہے۔

عبدالرحمٰن کی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ باپ دادا کی سلطنت چھن گئی، کوئی بھی قابلِ ذکر چیز پاس نہ رہی، بمشکل جان بچا کر وطن سے نکلا اور بے سروسامانی کے باوجود نئی سلطنت کا مالک بن گیا، لیکن اس کی سیرت کا جو پہلو خاص توجّہ کا مستحق ہے، یہ ہے کہ بہت بڑی سلطنت کا فرمانروا ہوتے ہُوئے بھی اُس نے عربی سادگی اور بے تکلفی قائم رکھی۔ ہمیشہ سفید لباس پہنتا اور سفید عمامہ باندھتا۔ مرکزِ حکومت میں جن لوگوں کے بیمار ہونے کی خبر مل جاتی، وہ امیر ہوتے یا غریب، سب کی مزاج پُرسی کے لیے ان کے گھروں میں جاتا۔ ہر جنازے کی نماز آپ پڑھاتا اور ہر میّت کو دفن کرنے میں شریک ہوتا۔ جو شخص بھی ملاقات کے لیے آ جاتا، اس سے بے تکلّف ملتا۔ ہر شکایت پر خود توجّہ کرتا اور انصاف کے تقاضے پُورے کرنے میں بڑے، چھوٹے یا طاقتور اور کمزور میں امتیاز کا روادار نہ تھا۔ ایک مرتبہ سوار ہو کر باہر جا رہا تھا۔ ایک شخص نے اس کے گھوڑے کی باگ تھام کر روک لیا اور کہا کہ جب تک میرا انصاف نہ کرو گے، ہلنے نہ دوں گا۔ عبدالرحمٰن نے فوراً قاضی کو بُلوایا اور کھڑے کھڑے اپنے سامنے فریادی کا فیصلہ کروایا۔

ایک مظلوم خاتون کی فریاد سُنی جاتی ہے

ہارون الرشید کے بیٹے معتصم کی خلافت کا زمانہ تھا، جسے عباسی خاندان کے عہد شباب کا آخری بڑا تاجدار مانا جاتا ہے۔ عباسی خلافت اور مشرقی رومی سلطنت کی حدیں ایشیائے کوچک میں ملتی تھیں۔ دونوں حکومتوں نے سرحدوں پر مضبوط قلعے تعمیر کر رکھے تھے اور ان کے درمیان وقتاً فوقتاً لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔

عباسیوں کے زمانے میں جو فتنے بپا ہوئے، ان میں سے بابک خرمی کا فتنہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جس نے بیس سال میں کم و بیش ایک لاکھ پچپن ہزار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ معتصم نے بڑی سختی سے اُس کی گوشمالی کی۔ جب اُسے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اپنے اوپر خلافت کے لشکروں کا دباؤ کم کرنے کے لیے مشرقی رُومی سلطنت کے قیصر کو کہلا بھیجا کہ تمام فوجیں میرے مقابلے پر آئی ہوئی ہیں۔ اس وقت حملہ کرو گے تو علاقوں پر علاقے فتح کرتے ہوئے بغداد پہنچ جاؤ گے۔ قیصر نے فوراً حملہ کر دیا، لیکن اس اثنا میں بابک مارا گیا۔ اس کا فتنہ مٹ گیا اور عباسی فوجیں اس کی طرف سے فارغ ہو گئیں۔

معتصم دربار میں بیٹھا تھا جب اُسے قیصر کے حملے کی خبر ملی۔ خبر دینے والے نے یہ بھی بتایا کہ دو اہم سرحدی قلعے قیصر کے قبضے میں جا چکے ہیں۔ معتصم کی پیشانی پر غصے اور غیظ سے شکنیں پڑ گئیں، لیکن وہ چُپ چاپ بیٹھا ہوا سب کچھ سُنتا رہا۔ یکایک اس کے کان میں یہ الفاظ پہنچے کہ قیدیوں میں ایک ہاشمی خاتون بھی تھی۔ قیصر کے سپاہی اسے کشاں کشاں لے جا رہے تھے تو وہ بیچارگی کی حالت میں خلیفہ کو امداد کے لیے پکار رہی تھی۔ معتصم کی زبان پر ایک دم لبیک لبیک (میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں) کے الفاظ جاری ہو گئے۔ فوراً تختِ خلافت سے اُترا اور گھوڑے پر سوار ہو کر کوچ کا نقارہ بجوا دیا۔ فوج کا انتظار بالکل نہ کیا اور جوش و اضطراب کے پروں سے اڑتا ہوا اس مقام کی طرف روانہ ہو گیا، جہاں ہاشمی خاتون کی پکار کا واقعہ پیش آیا تھا۔ فوجی دستے راستے میں اُس کے ساتھ مل سکے۔

اُس نے تیز رَو سوار آگے بھیج دیئے کہ جہاں جہاں قیصر کے آدمیوں کو دیکھیں، مار بھگائیں اور لوگوں کو اطمینان دلائیں۔ قیصر تمام علاقے چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ معتصم نے عموریہ کو فتح کیا جو قیصر کا خاص مرکز تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس طرح دُنیا پر آشکارا کر دیا کہ سچا فرمانروا وہی ہے جو رعایا کے معمولی فرد کی پکار بھی دل کے کانوں سے سُنے۔

جلاوطن مالکِ مُلک بنتے ہیں

ہسپانیہ میں عبدالرحمٰن اوّل نے بنواُمیہ کی حکمرانی کا سنگِ بُنیاد رکھا تھا۔ عبدالرحمٰن کے پوتے الحکم (۷۹۶ء-۸۲۲ء) کے عہدِ حکومت میں قرطبہ کے اندر ایک خوفناک بغاوت کی آگ بھڑکی۔ باغیوں نے قصرِ شاہی پر ہلّہ بول دیا۔ الحکم نے حسنِ تدبیر سے فوج جمع کی، بغاوت کو فرو کر دیا اور باغیوں کو حکم دے دیا کہ ہسپانیہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک جماعت مراکش پہنچ کر طنجہ اور فاس میں مقیم ہوگئی۔ باقی لوگوں نے جن کی تعداد دس اور پندرہ ہزار کے درمیان بتائی جاتی ہے جہازوں پر سوار ہو کر اسکندریہ کا رُخ کیا اور وہاں پہنچتے ہی شہر پر قابض ہوگئے۔ وہ مصر میں کوئی ہنگامہ بپا کرنے کے خواہش مند نہ تھے، جو اس زمانے میں عبّاسی خلافت کا ایک صُوبہ تھا اور مامون الرّشید تختِ خلافت پر متمکّن تھا۔ ان کی آرزُو صرف یہ تھی کہ کوئی موزوں بحری مقام ہاتھ آجائے، جسے مرکز بنا کر وہ بحیرۂ رُوم کے ان جزیروں کو فتح کر سکیں جو اس وقت تک رُومیوں اور یونانیوں کے قبضے میں تھے۔ انھی میں سے ایک جزیرہ کریٹ تھا جس کے بعض حصّوں میں ان جلاوطنوں نے عمل دخل کی صُورت پیدا کر لی تھی۔

مامون الرّشید کیوں کر گوارا کر سکتا تھا کہ اس کے ایک بڑے بحری مرکز پر غیر لوگ قابض ہو جائیں۔ غیر بھی وہ جو ہسپانیہ سے جلاوطن ہُوئے تھے اور ان کے پاس کوئی خاص جنگی قوّت نہ تھی۔ اس نے اپنے مشہور سپہ سالار عبداللہ بن طاہر کو مصر بھیجا اور اس نے جلاوطنوں کو اسکندریہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

اب ان لوگوں کے لیے خُدا پر بھروسا کرتے ہُوئے لڑ مرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ اسکندریہ کو تو اُنھوں نے چھوڑ دیا، جو جہاز ہاتھ آئے، اُنھیں لے کر سمندر میں نکل پڑے۔ ابوعمر حفص بن عیسٰی ان کا سردار تھا۔ وہ سیدھے کریٹ پہنچے اور ایک ہی ہلّے میں رُومی فوج کو جزیرے سے بھگا دیا۔ وہاں جو حکومت قائم کی، وہ کم و بیش ایک سو سال تک کامیابی سے

جاری رہی۔ عجیب بات ہے کہ جب مسلمانوں نے پہلے کریٹ پر حملہ کیا تو اسے فتح نہ کر سکے تھے اور ان کی توجہ دوسرے علاقوں کی طرف پھر گئی تھی، لیکن چند ہزار مسلمان جلاوطنوں نے نہ محض اس جزیرے کو مسخر کر لیا، بلکہ وہاں پائیدار اور کامیاب حکومت قائم کر لی۔

تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی واقعہ ہے کہ جو لوگ پہلے ہسپانیہ سے، پھر اسکندریہ سے جلاوطن ہوئے انھوں نے زورِ بازو سے ایک بہت بڑا جزیرہ فتح کر لیا۔ ابوحفص کریٹ پہنچا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"بتاؤ اب تمھارے لیے شکایت کا کون سا موقع ہے؟ میں تمھیں اس سرزمین میں لے آیا ہوں، جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ اسی کو اپنا وطن سمجھو، راحت و آسائش کی زندگی بسر کرو اور اپنے سابقہ وطن کو بالکل بھول جاؤ۔"

یہ مسلمان کریٹ کے ساحل پر جہاں اترے تھے، وہاں اپنی قیام گاہ کے اردگرد حفاظت کے لیے انھوں نے خندق کھود لی تھی۔ بعد میں اس مقام کا نام "الخندق" مشہور ہو گیا۔ اسی نام کو اہلِ یورپ نے بگاڑ کر 'کینڈیا' بنا دیا، جو کریٹ کا دوسرا نام ہے۔

"الخندق" اور کینڈیا کی بنیادی یکسانی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

اسلامی تاریخ میں اس قسم کے حیرت انگیز واقعات کی کبھی کمی نہیں رہی۔ ایسے نادر واقعات بھی ملتے ہیں کہ مثلاً مسلمانوں نے ایک شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ محصورین نے ایک مرتبہ شہر کا دروازہ کھول کر مسلمانوں پر یورش کی۔ ایک جیش کا سالار مقابلے کے لیے آگے بڑھا اور محصورین کو شکست دے کر لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ ان کے پیچھے پیچھے خود بھی شہر کے اندر پہنچ گیا۔ وہ لڑائی میں اتنا محو تھا کہ بالکل خبر نہ ہو سکی کہ ساتھی باہر رہ گئے ہیں، لیکن اس صورتِ حال پر گھبرایا نہیں، تنہا شہر میں لڑتا رہا۔ ہر طرف سے اس پر تیروں اور پتھروں کی بارش ہوتی رہی لیکن جب تک زندگی نے ساتھ دیا، لڑائی نہ چھوڑی۔

جوانمردی کی اس یگانہ مثال نے ساتھیوں میں ایسا جوش پیدا کر دیا کہ وہ ہر مشکل سے بے پروا ہو کر شہر کے اندر پہنچ گئے اور اسے فتح کر لیا۔ یہ کارنامہ دراصل صرف ایک سالار کی بے مثال بہادری کا کرشمہ تھا۔

پُرانے علوم نئے سرے سے زِندہ ہوتے ہیں

انسانیت کی ایک بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ مختلف زبانوں میں جو علمی کتابیں تصنیف ہوئیں، انھیں زمانے کی دستبُرد سے محفوظ کر دیا جائے اور ایسا بندوبست کر دیا جائے کہ آنے والی نسلیں ان سے فائدہ اُٹھاتی رہیں۔

اسلام دُنیا میں آیا تو قوموں کے درمیان تعصّب اتنا بڑھا ہُوا تھا کہ کوئی کسی کو اچھی نگاہ سے دیکھنے کے لیے تیار نہ تھا اور اپنے سوا ہر قوم کی ہر شے کو فنا کر دینا ہی سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا تھا، لیکن مسلمانوں نے اس تاریک زمانے میں بھی گزری ہوئی قوموں کے تمام علوم محفوظ کر دیئے۔ اگر یہ کام انجام نہ پاتا تو علم و تجربہ اور غور و فکر کا وہ پُورا سرمایہ مٹ جاتا، جو پہلے لوگوں نے پیدا کیا تھا۔ حفاظت کے بعد مسلمانوں نے ان علوم کو ایسے انداز میں پھیلایا کہ ان میں زندگی کی نئی رُوح پیدا ہو گئی۔

سب سے پہلے ان کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں ہوئے جن میں مختلف علاقوں کے خراج کی کیفیت درج تھی یا جن کا تعلق علم طب سے تھا۔ پھر اہلِ علم نے اپنے شوق سے اور حکومت نے علوم کی سرپرستی کرتے ہوئے تمام ضروری کتابوں کے ترجمے شروع کرا دیئے۔ اس غرض سے عربوں نے بھی دُوسری زبانیں سیکھیں اور مفتوحہ علاقوں کے علم دوست لوگوں نے بھی عربی میں خاصی مہارت حاصل کر لی۔

علوم کی سرپرستی میں عباسیوں کا درجہ سب سے بڑھا ہُوا ہے، خصوصاً مامون الرشید کا نام تو اس سلسلے میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ترجمے کے لیے ایک خاص محکمہ قائم ہو چکا تھا۔ مامون نے اسے بہت ترقی دی۔ تمام ملکوں میں آدمی بھیج کر اچھی اچھی کتابوں کے نسخے جمع کرائے۔ پھر قیصر کو لکھا کہ جو نادر کتابیں ہاتھ آئیں، بھیج دی جائیں۔

تمام مترجموں کے نام معلوم کرنے کا تو کوئی ذریعہ نہیں جو سیکڑوں سال اس محکمے میں کام کرتے رہے، صرف بعض لوگوں کے نام مختلف کتابوں میں درج ہوئے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ تیئیس مترجم وہ تھے جو فارسی زبان کی کتابیں ترجمہ کرتے تھے۔ اسی طرح دس سُریانی زبان کے، پانچ سنسکرت زبان کے اور سنتالیس یونانی و لاطینی زبان کے مترجم تھے۔ کوئی علم نہ تھا جسے اُنھوں نے چھوڑا ہو۔ مشہور حکیموں، فلسفیوں اور طبیبوں

کی ایک ایک کتاب اور ایک ایک رسالہ فراہم کر کے اسے عربی کا لباس پہنا دیا۔ اگر مسلمان یہ خدمت انجام نہ دیتے تو آج اکثر کے نام بھی کسی کو معلوم نہ ہو سکتے۔ پھر مسلمانوں نے خود مختلف علوم پر ایسی پائے کی کتابیں لکھیں کہ اہلِ یورپ نے ان کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا۔ بوعلی سینا کی کتاب قانون کا لاطینی ترجمہ پانسو سال تک یورپ کی طبّی یونیورسٹیوں میں بطور نصاب پڑھایا جاتا رہا۔

بعض اہم کتابوں پر شرحیں لکھیں۔ مثلاً افلاطون کا طریقہ یہ تھا کہ اپنی ہر بات خاص عالمانہ انداز میں بیان کرتا اور عام لوگ اسے نہ سمجھ سکتے۔ ارسطو نے زیادہ روشن اندازِ تحریر اختیار کیا تو افلاطون نے لکھا کہ تم علم کو پامال اور عامیانہ کیوں بنا رہے ہو۔ اس وجہ سے خود یونانیوں کو ان حکیموں کا مطلب سمجھنے میں مشکلیں پیش آئیں اور وہ ہر تشریح میں غلطیاں کر جاتے تھے۔ مسلمانوں میں سے ابونصر فارابی نے افلاطون وارسطو کے اندازِ تحریر پر ایک رسالہ لکھا اور ان تمام مقامات کی صحیح تشریح کر دی، جن میں مختلف علمی طبقوں نے ٹھوکریں کھائی تھیں۔ صرف بغداد یا ایشیا و افریقہ کے بڑے بڑے علمی مرکزوں ہی میں نہیں، بلکہ ہسپانیہ کی اسلامی حکومت کے زیرِ سرپرستی بھی پُرانے علوم کی حفاظت، تشریح اور تجدید انتہائی اہتمام سے ہوئی۔ اگر افلاطون، ارسطو، سقراط، بقراط، جالینوس وغیرہ کے نام بچّے بچّے کی زبان پر جاری ہوئے تو یہ سب مسلمانوں کی علمی خدمات کا کرشمہ ہے، ورنہ ان لوگوں کے علوم زمانے کی ناقدرشناسی کے ہاتھوں ان کے ساتھ مر چکے ہوتے اور آج ان کا بھی کہیں سُراغ نہ مل سکتا۔

عرب ایٹم بم تیار کرتے ہیں

ایٹم بم موجودہ زمانے کا نہایت خوفناک ہتھیار ہے۔ اِسے صرف دو مرتبہ جاپان کے دو شہروں پر استعمال کیا گیا، جس سے ہزاروں آدمی ہلاک ہو گئے۔ کئی کئی مربع میل زمین پر بربادی کی جھاڑو پھر گئی۔ پہلے زمانے میں بھی ایسی چیزیں ایجاد ہوتی رہیں جن کے متعلق لوگوں کا وہی خیال تھا جو ایٹم بم کے متعلق ہے۔ ان میں سے وہ آتش گیر روغن خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو عربوں نے تیار کیا تھا اور صلیبی جنگوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ اہلِ فرنگ نے اس کا نام "گریک فائر" یعنی یونانی آگ" رکھا۔ شاید اس لیے کہ اس روغن کے آگ پکڑنے کا نظارہ پہلے پہل قسطنطنیہ میں اُنھوں نے دیکھا تھا اور قسطنطنیہ اس وقت یونانی شہر تھا۔

اس روغن کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا تھا۔ کبھی بڑی بڑی پچکاریوں میں بھر کر دُور دُور پھینکتے یا بھالوں اور تیروں کے پھلوں پر یہ روغن مَل دیتے۔ ہوا لگتے ہی یہ بھالے اور تیر آگ پکڑ لیتے۔ کمان کی شکل کا ایک آلہ بنا لیا گیا تھا جسے توپ کی بیٹری کی طرح زمین میں نصب کر لیتے۔ اس کی مار منجنیق سے بھی زیادہ تھی۔ اس کے ذریعے سے روغن دُور دُور پہنچا دیا جاتا۔

تیروں کے ذریعے آتش باری کا سلسلہ تو عربوں نے پہلے دَور ہی میں شروع کر دیا تھا۔ محمد بن قاسم نے راوڑ کی جنگ میں اَیسے تیر اندازوں سے کام لیا تھا جن کے تیر کمانوں سے نکلتے ہی سراپا آگ بن جاتے تھے۔ بعد ازاں آتش گیر روغن سے کام لینے کا فن بہت ترقی کر گیا۔ صلیبی جنگوں میں عربوں نے یہ روغن استعمال کیا تو اہلِ فرنگ پر عجیب ہراس طاری ہو گیا۔ وہ اس قدر دہشت زدہ ہو گئے کہ اس آگ کو دیکھتے

ہی پناہ کے لیے بُرجوں کے اندر گھُس جاتے لیکن آگ ایسی خوفناک ہوتی کہ بُرج بھی اس کی جلن اور تپش سے بچاؤ میں بے کار ثابت ہوتے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آگ کو پانی سے فوراً بجھایا جا سکتا ہے، لیکن اس آگ پر پانی ڈالا جاتا تو یہ اور بھڑکتی۔ یہ روغن مٹی کے تیل سے تیار کیا جاتا تھا لیکن اس میں کئی مسالے ایسے ملا دیئے جاتے تھے کہ اس کی تیزی اور حدت بے پناہ بن جاتی تھی۔

یہ روغن بری اور بحری دونوں لڑائیوں میں یکساں استعمال ہوتا تھا۔ عربوں نے اپنے جہازوں میں جا بجا بڑی بڑی پچکاریاں لگا رکھی تھیں جن میں سے کسی کی شکل اژدہے کی سی ہوتی، کسی کی شیر یا گھڑیال کی سی۔ دشمن کے جہازوں پر یہ روغن پڑتے ہی ان میں آگ لگ جاتی اور وہ جل کر خاکستر بن جاتے

ہوا میں تیر یا روغن پھینکنے سے خط قوسی جیسی حرکت پیدا ہوتی تو ساتھ ہی روغن آگ پکڑ لیتا۔ پہلے ایک دھماکا سا ہوتا۔ پھر سخت غلیظ دھواں نکلتا۔ اسی میں سے شعلے نمودار ہو جاتے۔ ایک یورپی مؤرخ نے لکھا ہے کہ یہ آگ رات کو برسائی جاتی تو سارا کیمپ روشن ہو جاتا۔ لوگ گھبرا گھبرا کر اوندھے منہ گر جاتے اور آستینوں سے سر چھپا لیتے۔ آگ ہوا میں اڑتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ لمبی دُم والا پر دار آتشیں اژدہا اُڑا چلا آرہا ہے۔ رعد کی کڑک اور بجلی کی چمک دونوں چیزیں اس میں موجود ہوتیں۔ یہ آج سے سات آٹھ سو سال پیشتر کا ایٹم بم تھا جو عربوں نے ایجاد کیا تھا۔

اس کے بعد سائنس نے دوسری خوفناک چیزوں کی ایجاد شروع کر دی۔ اب کسی کو "یونانی آگ" کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ حالانکہ چھ سات سو سال پیشتر تک یہ آگ لڑائیوں میں سب سے بڑھ کر تباہی خیز سمجھی جاتی تھی۔ حق یہ ہے کہ ایجاد وہی قابلِ قدر ہے جس سے انسانوں کے بڑے سے بڑے حصے کو فائدہ پہنچے۔ اس ایجاد کو کون اچھا سمجھ سکتا ہے جو بڑی بڑی آبادیوں کو آنکھ جھپکتے ہی روئے زمین سے محو کر ڈالے۔

اگر دُنیا کی تمام قومیں آپس میں امن کا پختہ عہد کریں اور سائنس کی تمام ترقیات کو انسانیت کی بہتری اور بہبود کے لیے وقف کر دیا جائے تو یقین ہے کہ یہ دُنیا تھوڑی ہی مُدت میں خیر و برکت کی بہشت زار بن جائے۔
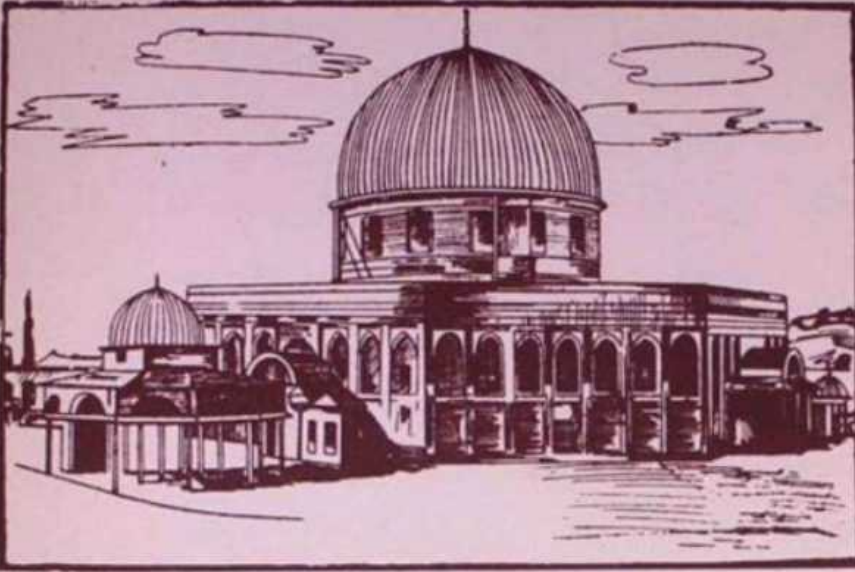
بیت المقدس پر اسلامی پرچم لہراتا ہے

صلیبی جنگوں میں ایک مرتبہ فلسطین کا کچھ علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن گیا تھا جس میں بیت المقدس بھی شامل تھا۔ صلیبی سرداروں نے وہاں اپنی بادشاہت قائم کر لی تھی۔ جن مسلمان بادشاہوں نے چھنے ہوئے علاقے کو واپس لیا، ان میں سلطان نورُ الدّین محمود زنگی اور سلطان صلاحُ الدّین ایّوبی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

صلیبیوں کے خلاف زبردست تیاریوں کا آغاز نورُالدین زنگی کے والد عمادُ الدّین زنگی کے زمانے میں ہوا۔ سرداروں میں سے نجمُ الدین اور شیر کوہ عمادالدین کے دست و بازو تھے۔ نجمُ الدین ہی کے گھر وہ بچّہ پیدا ہوا، جو آگے چل کر شہرت کے آسمان پر چمکنے والا تھا۔ نام اگرچہ یُوسف رکھا گیا، لیکن وہ صلاح الدین کے لقب سے مشہور ہوا۔

سُلطان صلاحُ الدین نے صلیبیوں سے لڑائی کی پوری تیاریاں کر لی تھیں صرف ایک خدشہ باقی رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ مصر میں فاطمیوں کی حکومت تھی۔ اگر وہ صلیبیوں کے ساتھ اتحاد کر لیتے تو نورُالدین کے تمام منصوبوں پر پانی پھر جاتا۔ خطرے کے اس دروازے کو بند کرنے کے لیے سلطان نے شیر کوہ کو مصر بھیج دیا۔ وہ صلاحُ الدّین کو بھی ساتھ لے گیا۔ شیر کوہ نے جاتے ہی مصر کے انتظامات کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ جب وہ فوت ہوا تو اس کا منصب صلاح الدین نے سنبھال لیا۔

ابھی صلیبیوں کے خلاف کوئی فیصلہ کُن قدم نہ اُٹھایا گیا تھا کہ سُلطان نورُالدین محمُود نے وفات پائی۔ اس کا فرزند کم عمر تھا اور سخت لڑائیاں درپیش تھیں جن کے لیے ایک قابل اور تجربہ کار سپہ سالار کی ضرورت تھی۔ ملک کے مدبّروں نے یہی مناسب سمجھا کہ بادشاہی صلاحُ الدّین کے حوالے کر دی جائے۔

صلاحُ الدّین نے تیاریاں مکمل کیں اور لڑائیاں شروع کر دیں۔ صلیبیوں نے ہر مقام پر شکست کھائی اور انجام کار بیت المقدس میں محصُور ہو کر بیٹھ گئے۔ سُلطان نے ستمبر ۱۱۸۷ء کو شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مناسب مقامات پر فوجیں مورچے قائم کر کے بیٹھ گئیں۔ پیچھے پہاڑوں پر منجنیقیں لگا دی گئیں جو پتھر کے گولے شہر پر پھینکتی تھیں۔ جگہ جگہ سُرنگیں لگنے لگیں، تاکہ ان میں بارُود بھر کر دیواروں کو اُڑایا جا سکے۔

محصورین کو کامیابی کی کوئی اُمید نظر نہ آتی تھی۔
چونکہ نوّے سال پیشتر بیت المقدس کو فتح کر کے اُنھوں نے شہر کی آبادی پر بہت ظلم کیے تھے، اس لیے اپنے پُرانے گناہ کی یاد نے ان پر کپکپی طاری کر رکھی تھی۔ جب ان کی تکلیفیں حد سے گزر گئیں تو شہر حوالے کر دینے پر مجبور ہو گئے۔ آخر طے ہُوا کہ تمام لوگ اپنی حیثیت کے مطابق فدیہ ادا کر کے چلے جائیں۔ جو لوگ شہر میں رہنا چاہیں ان سے کچھ نہ کہا جائے۔

ساری کھینچ تان لڑائی تک تھی۔ لڑائی ختم ہو گئی تو کھینچ تان بھی نہ رہی اور سب کے ساتھ محبّت کا برتاؤ شروع ہو گیا۔ جو لوگ روپے دے سکے، وہ نکل گئے۔ جو باقی رہ گئے ان میں سے بہت سے لوگوں کو سُلطان نے معافی دے دی۔ جو صلیبی مارے جا چکے تھے یا قید ہو گئے تھے ان کی عورتیں اور بیٹیاں شہر میں آگئی تھیں۔ وہ سلطان کے پاس پہنچیں تو اس نے نہ صرف فدیے لینے چھوڑ دیے بلکہ حکم دے دیا کہ ان کے عزیزوں میں سے جتنے قیدی ہیں وہ سب رہا کر دیے جائیں۔ چنانچہ وہ عورتیں جہاں جہاں پہنچیں، سُلطان کی فیاضی کے ترانے گاتی ہوئی گئیں۔

ایک یورپی مؤرّخ نے لکھا ہے کہ صلیبیوں نے شہر پر قبضہ کیا تھا تو وہ اس بات کو بھُول گئے تھے کہ خدا کی سب سے بڑی صفت عدل ہے اور رحم، عدل کا تاج ہے۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ صلاح الدین کے ہاتھوں ان پر رحم و کرم ہُوا۔ سلطان کے کارناموں میں سے اگر صرف یہی کارنامہ دُنیا کو معلوم ہوتا تو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ سُلطان نہ صرف اپنے زمانے کا بلکہ تمام زمانوں کا بڑا ہی عالی حوصلہ اور بے مثل انسان تھا۔

غرض نوّے برس کے بعد بیت المقدس دوبارہ فتح ہُوا اور یہ فتح اس وجہ سے تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ بن گئی کہ جس زمانے میں ظلم و جوَر عام تھا، مفتوحین پر ہر قسم کی سختیاں روا رکھی جاتی تھیں، صلاحُ الدّین نے اس زمانے میں نرمی، رحم اور شفقت کا ایسا برتاؤ کیا، جس کی مثال اس دوَر ہی میں نہیں، بلکہ اکثر دوَروں میں نہیں ملتی۔
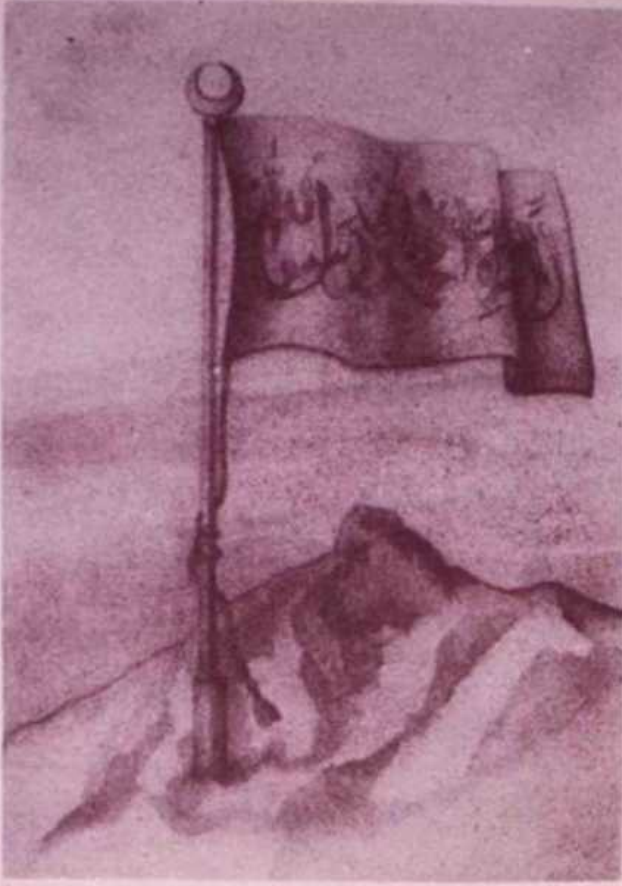
جوانمردوں کا جھنڈا اپنی حفاظت خود کرتا ہے

آپ نے شاید کبھی نہ سُنا ہوگا کہ حکومت کا جھنڈا کسی مقام پر نصب ہے اور اس کی حفاظت کے لیے کوئی سپاہی موجود نہیں، لیکن دشمن کو اس کے پاس آنے اور اُکھاڑنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ ہسپانیہ کی اسلامی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ بھی مذکور ہے جو دسویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ اس وقت ابن ابی عامر منصور ہسپانیہ کی اُموی سلطنت کا مختار تھا۔

یہ منصور بڑی عجیب شخصیت کا مالک تھا۔ بالکل غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ تعلیم مکمل کر کے معمولی حیثیت میں زندگی شروع کی اور بہت جلد ایسا اقتدار حاصل کر لیا کہ جو وہ چاہتا کرتا۔ اس زمانے میں ہسپانوی ریاستوں سے لڑائیاں جاری تھیں۔ منصور خود سال میں دو مرتبہ مقابلے کے لیے نکلتا۔ اپنے زمانۂ حکومت میں اس نے کم و بیش چھپن جہاد کیے۔

ایک مرتبہ منصور ایسی وادی میں چلا گیا، جہاں آمد و رفت کے لیے صرف ایک تنگ درّہ تھا۔ ہسپانویوں نے سوچا کہ شیر پنجرے میں آگیا ہے، اب اسے یہیں ختم کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ انھوں نے درّے کی ناکہ بندی کر لی۔ منصور نے یہ حالات دیکھے تو اپنی فوج کو دو حصّوں میں بانٹ دیا۔ ایک حصّے کو مناسب مقامات پر کھیتی باڑی کے لیے لگا دیا تاکہ فوج کے لیے خور و نوش کا سامان مہیا ہوتا رہے، دُوسرے حصّے کو لے کر اردگرد کی آبادیوں پر چھاپے مارنے لگا۔ جتنے لوگ روزانہ قتل ہوتے، ان کی لاشیں اُٹھوا کر درّے میں رکھوا تا جاتا۔ چند روز کے بعد ہسپانویوں نے خود درخواست کی کہ آپ جو شرطیں پیش کریں، ہم منظور

کرتے ہیں، درّے سے فوج ہٹالی ہے، بہ اطمینان تشریف لے جائیں۔

حفاظت کے اسباب سے محرُومی کسی کو بھی خوشگوار معلوم نہ ہوگی، لیکن جوانمردوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ جب شدید مُشکلات میں گھر جاتے ہیں تو پریشان ہونے کے بجائے مشکلات میں سے نئی کامرانیوں کا راستہ پیدا کر لیتے ہیں۔

منصور نے جن ہسپانوی ریاستوں سے عہدنامے کر رکھے تھے، ان پر ایک شرط یہ بھی لگائی تھی کہ ان کی حدود میں کوئی مسلمان قیدی نہ رہنے پائے۔ ایک مرتبہ اس کا ایلچی شمالی ہسپانیہ کی ایک ریاست میں گیا۔ سیر و سیاحت کرتے ہوئے اُسے معلوم ہُوا کہ چند پادریوں نے ایک مُسلمان عورت کو قیدی بنا کر کلیسا کے کام پر لگا رکھا ہے۔ منصور کو یہ اطلاع ملی تو خود فوج لے کر اس صوبے میں پہنچ گیا۔ حاکم نے حاضر ہو کر حلف اُٹھایا کہ مجھے اس خاتون کی اسیری کا علم نہ تھا اور اس نے مجرموں کو سخت سزائیں دیں۔

یہی منصور ایک مرتبہ لڑائی کے لیے گیا۔ فوج کے دستوں نے جگہ جگہ اپنے اپنے جھنڈے نصب کر رکھے تھے۔ جنگ ختم ہوگئی اور فوج کو واپسی کا حکم ملا تو اتفاق سے ایک جھنڈا، جو پہاڑی پر نصب تھا، بہ دستور نصب رہا۔ اگرچہ پُوری فوج واپس چلی گئی تھی اور کوئی شخص جھنڈے کے پاس موجود نہ تھا، لیکن دشمن کو اسے اُکھاڑنے کی جرأت نہ ہوئی۔ یہی سمجھا گیا کہ اگر اسے اُکھاڑ لیا تو منصور سخت سزا دے گا۔

جھنڈا کیا ہوتا ہے؟ لکڑی کا ایک ڈنڈا اور دو گز کپڑا، لیکن جب وہ ایک فوج، ایک ملک اور ایک قوم کی عزّت کا نشان بن جاتا ہے تو ہزاروں بہادر اس کے سائے میں اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ کس قدر خوش نصیب تھا وہ جھنڈا، جسے اپنے جانبازوں کی فیروزمندیوں کے طفیل وہ بلند مقام حاصل ہُوا کہ اگرچہ ایک بھی متنفّس اس کی حفاظت کے لئے موجود نہ تھا، تاہم کسی کا ہاتھ اس کی طرف نہ بڑھا۔ گویا غیرت و حمیّت کے پیکروں نے ایک بے جان جھنڈے میں ایسی شان پیدا کر دی تھی کہ وہ اپنی حفاظت خود کرتا رہا۔

نقشہ جبل الطارق
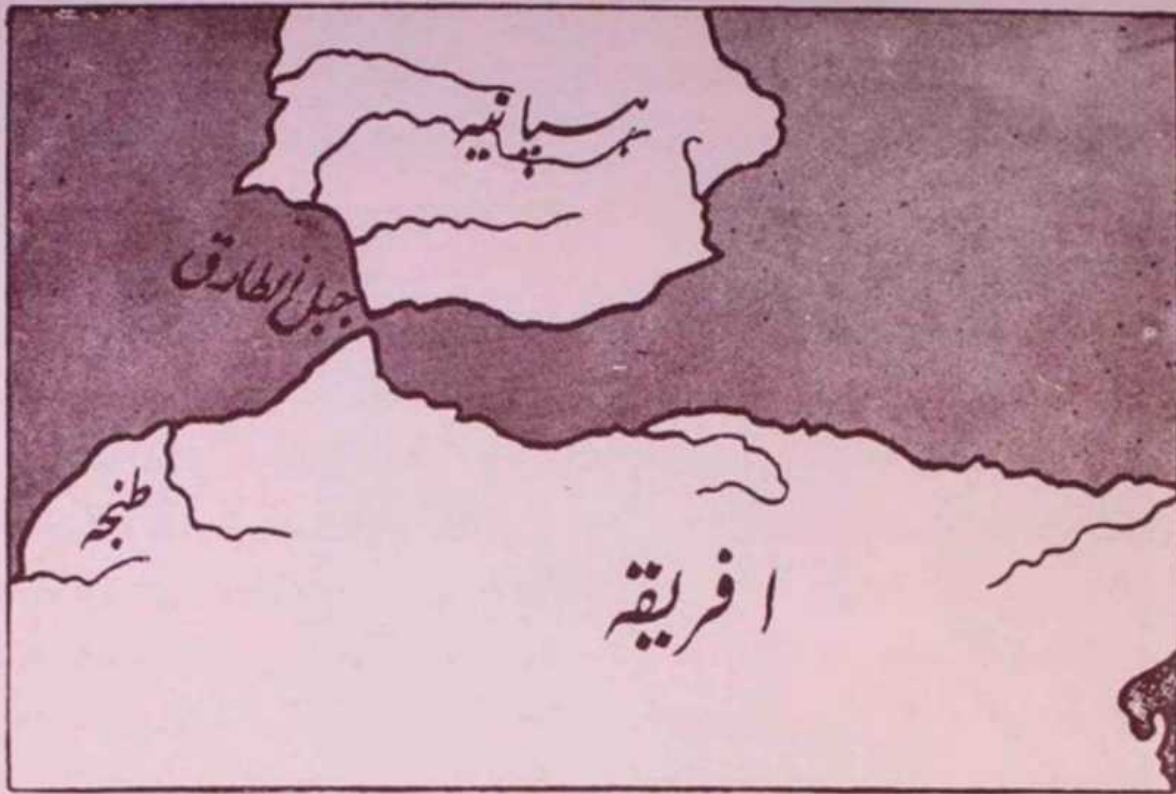
جو کچھ ہونے والا ہے تیرے سامنے آجائے گا

سلطنتوں پر زوال کا دور آتا ہے تو ان کی قوّت مٹنے لگتی ہے اور ایک مرکزی حکومت کی جگہ کئی حکومتیں وجود میں آجاتی ہیں۔ ہسپانیہ میں عرب ساڑھے تین سو سال تک جاہ و جلال سے حکومت کر چکے تو ان کی مرکزی قوّت بھی کئی ریاستوں میں بٹ گئی جو اکثر آپس میں لڑتی رہتی تھیں اور بعض ایک دُوسری کے خلاف ہسپانیہ کے بادشاہ الفانسو سے بھی مدد طلب کر لیتی تھیں۔ اس طرح الفانسو کو قدم آگے بڑھانے کا موقع ملتا رہا اور وہ تمام عرب ریاستوں کے لیے خطرہ بن گیا۔

ان میں سے ایک اشبیلیہ کی ریاست تھی جس کے فرمانروا معتمد نے بادشاہی میں بلند مرتبہ حاصل کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن شعر و ادب میں اس نے لازوال شہرت پائی۔ ڈاکٹر اقبالؒ نے بھی اس کے عربی اشعار کو اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ معتمد کے مشورے سے تمام عرب ریاستوں نے مراکش کے حکمران یُوسف بن تاشفین کو اپنی امداد کے لیے ہسپانیہ بُلا لیا۔ وہ فوج لے کر پہنچا تو الفانسو نے اُسے لمبا چوڑا خط لکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ کیوں مرنے کے لیے ہسپانیہ آئے ہو۔ بہتر ہے چُپ چاپ واپس چلے جاؤ۔ میں مراکش میں آکر تمہارا شوقِ جنگ پُورا کر دوں گا۔ یوسف نے اس خط کی پُشت پر صرف تین لفظ لکھے اور اسے بجنسہٖ واپس کر دیا۔ ان لفظوں کا مفہوم یہ تھا کہ "جو کچھ ہونا ہے، تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔"

غرض فوج لے کر یُوسف آگے بڑھا۔ عرب ریاستوں

کے جنگجو بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ صوبہ بطلیوس کے ایک میدان زلاقہ میں الفانسو سے مقابلہ ہوا۔ یوسف بن تاشفین اور عرب ریاستوں کی فوج بیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ الفانسو کے جھنڈے کے نیچے کم از کم ساٹھ ہزار آدمی تھے۔ ان میں دُور دور کے علاقوں سے فوجی دستے شامل ہو گئے تھے، اس لیے کہ عوام نے اسے قومی جنگ کی حیثیت دے دی تھی۔

الفانسو نے یُوسف کو پیغام بھیجا کہ جمعہ مسلمانوں کے نزدیک مقدّس دن ہے، مسیحی بھی اتوار کو مقدّس مانتے ہیں، لہٰذا دو دن تو کوئی لڑائی نہ ہونی چاہیئے۔ البتہ ہفتے کا دن مقرر کر لیا جائے تو مناسب ہے۔ یوسف نے یہ تجویز منظور کر لی۔ دراصل یہ ایک فریب تھا۔ الفانسو چاہتا تھا کہ اُسے بے خبری میں مسلمانوں پر ٹوٹ پڑنے کا موقع مل جائے۔ چنانچہ مسلمان جمعہ کی نماز ادا کر رہے تھے کہ اچانک الفانسو نے حملہ کر دیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ یوسف اپنی فوج کو لے کر ایک الگ مقام پر جا کھڑا ہوا اور عرب ریاستوں کی فوجیں الفانسو کے تیز و خونریز حملوں کا نشانہ بنی رہیں۔ جب یُوسف نے دیکھا کہ الفانسو کی فوج خاصی تھک گئی ہے تو پہاڑ کے عقب میں سے ہوتا ہُوا الفانسو کے پیچھے سے حملہ آور ہُوا۔ یہ حملہ ایسا سخت تھا کہ الفانسو کے چھکے چھُوٹ گئے۔ ساتھ ہی اس کے کیمپ کو آگ لگا دی گئی۔ الفانسو نے شکست فاش کھائی۔ اُس کی فوج میں سے کم از کم بیس ہزار آدمی کھیت رہے۔ اس ایک فتح نے مسلمانوں کے لیے ہسپانیہ پر مزید چار سو سال کے لیے حکمرانی کی صُورت پیدا کر دی۔ یہ لڑائی جو دُنیا کی چند فیصلہ کُن لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے ۲۳ر اکتوبر ۱۰۸۶ء کو ہوئی تھی۔

یُوسف عجیب و غریب شخص تھا۔ ایک سو سال کی عمر پائی اور اس طویل عمر میں ایک دن کے لیے بھی بیمار نہ ہُوا۔ جَو اور جوار کے دلیے کے سوا کوئی غذا نہ کھائی۔ گیہوں کی روٹی، بکری کا گوشت یا گائے کا دُودھ کبھی نہ چکھا۔ صوف کا لباس پہنتا تھا اور زمین پر سوتا تھا۔ سینتالیس سال کی حکمرانی کے بعد ۱۱۰۷ء میں فوت ہُوا۔ مراکش میں اس کا مزار ہے۔
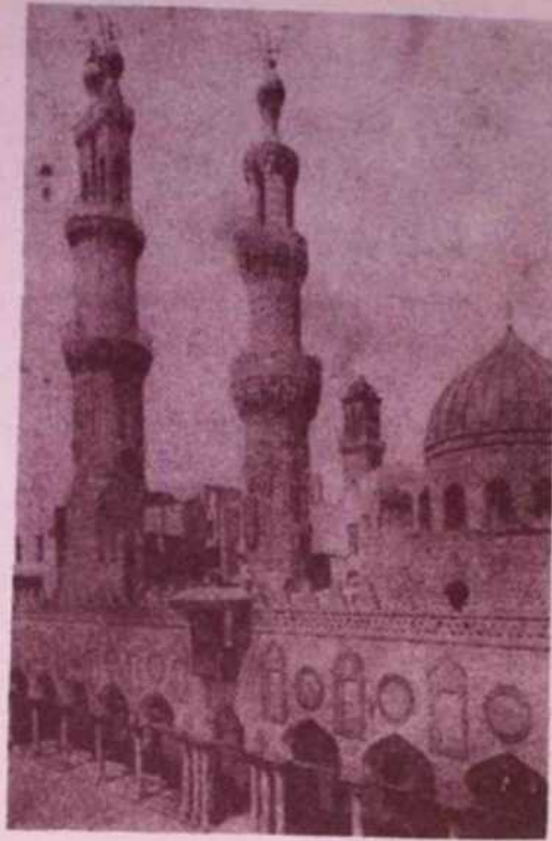
دُنیا کی مشہور ترین یونیورسٹی قائم ہوتی ہے

فاطمی خلافت کا بانی عبیداللہ المہدی حضرت اسماعیل بن حضرت امام جعفر صادق کی اولاد میں سے تھا۔ عبیداللہ کے ایک داعی ابوعبداللہ حسن نے تونس، الجزائر اور مراکش کے بربریوں میں بڑے اہتمام سے دعوت کا انتظام کیا اور بہت جلد حامیوں کی ایک جمعیت پیدا کر لی۔ پھر قیروان پر حملہ کر کے اغلبیوں کی سلطنت کا نام و نشان تک مٹا کر ۹۰۹ء میں عبیداللہ المہدی کو خلیفہ بنا دیا۔ ساحل بحر پر مہدیہ کے نام سے نیا دارالحکومت بنایا جہاں سے فاطمی خلافت کا آغاز ہوا۔

۹۶۹ء میں فاطمیوں کے ایک سپہ سالار جوہر صقلی نے جسے جوہر رومی بھی کہتے ہیں، مصر کو فتح کر لیا اور فسطاط کے پاس جو ابتدا سے عربی سلطنت کا مرکز چلا آتا تھا، نئے شہر کی بنیاد رکھی، جس کا نام قاہرہ تجویز ہوا۔ یہ شہر ایک ہزار سال سے مصر کا پایۂ تخت چلا آتا ہے۔ فاطمیوں، ایوبیوں، مملوکوں، ترکوں اور خدیووں کے عہد میں اس کی عظمت درجۂ کمال پر پہنچ گئی اور آج بھی شرقِ اوسط میں تاریخی آثار کا نہایت بیش قیمت خزانہ اسی شہر کی گود میں محفوظ ہے۔

لیکن قاہرہ کی ساری عظمت مادی تھی۔ وہاں جوہر رومی نے ایک ایسی عمارت بھی بنائی جو ایک ہزار سال سے مشرقی اور اسلامی علوم و فنون کا سب سے بڑا سرچشمہ چلی آتی ہے۔ یہ سب سے بڑی علمی

میراث ہے جو اسلام اور انسانیت کو ملی۔

جوہر نے ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی جس کا نام 'الازہر' رکھا۔ پانچویں فاطمی خلیفہ العزیز (۹۷۵ - ۹۹۲ء) نے اس میں دینی علوم کا سلسلہ شروع کرکے اس کے لیے اوقاف کا انتظام کر دیا، تاکہ اساتذہ کی تنخواہوں اور طلبا کے وظیفوں کا پورا انتظام ہوتا رہے۔ آہستہ آہستہ یہ یونیورسٹی سارے عالم اسلام کے لیے ایک مرکزی درس گاہ بن گئی، جس کی سند مشرق و مغرب میں سب سے زیادہ عزّت و احترام کا وثیقہ سمجھی جاتی ہے اور الازہر کا نام بچّے بچّے کی زبان پر چڑھ گیا۔

الازہر کا چشمۂ فیض ایک ہزار سال سے برابر جاری ہے۔ حکومتِ مصر نے مغربی علوم اور مغربی زبانوں کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے قدیم تعلیم کے علاوہ دورِ حاضر کی تعلیم کے لیے الگ انتظام کر دیا۔ بیرونی طلبا کے لیے قیام گاہیں ہیں۔ کھانے کے لیے وظیفہ مل جاتا ہے۔

قلبِ ہند میں اسلامی تخت بچھتا ہے

ہندوستان میں پہلی اسلامی حکومت محمد بن قاسم نے قائم کی، لیکن وہ اس وسیع ملک کے صرف ایک گوشے تک محدود رہی۔ محمود غزنوی آندھی کی طرح دور دور پھر نکلا، لیکن پنجاب کے سوا کوئی حصّہ اس کی سلطنت میں شامل نہ ہوا۔ جس شخص نے ہندوستان کے قلب میں تخت سلطنت بچھایا اور پورے برِ اعظم کی فضا میں اسلامی پرچم اُڑانے کا موقع پیدا کیا وہ شہاب الدّین محمد غوری تھا۔

محمد غوری نے اپنے بڑے بھائی سلطان غیاث الدین کے نائب کی حیثیت میں کام شروع کیا۔ وہ پہلے غزنہ کا حاکم بنا۔ جب اُس نے دیکھا کہ لاہور کے غزنوی حکمران کمزور ہو چکے ہیں اور ان کے علاقے چھین چھین کر غیروں کے قبضے میں جا رہے ہیں تو لاہور اور پنجاب پر خود قابض ہو گیا۔ اس زمانے میں دہلی اور اجمیر کی سلطنت بہت بڑی قوت کی مالک سمجھی جاتی تھی۔ اس کے فرمانروا پرتھوی راج نے غزنوی سلطنت کے کچھ علاقے لے لیے تھے، محمد غوری نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تو پرتھوی راج سے لڑائی چھڑ گئی۔

پہلی لڑائی ۱۱۹۱ء میں ہوئی۔ غوری کے پاس فوج کم تھی۔ پرتھوی راج کے ساتھ دو لاکھ سپاہی اور تین ہزار جنگی ہاتھی تھے۔ ایک حادثہ یہ پیش آیا کہ غوری سخت زخمی ہو گیا اور بے ہوش ہو کر گھوڑے سے گرنے ہی لگا تھا کہ ایک وفادار خادم نے اُسے سنبھالا اور میدان سے باہر لے گیا۔ سُلطان کا گھوڑا فوج کو نظر نہ آیا تو وہ بھی میدان چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔

اس اتفاقی شکست نے غوری کے دل کو اتنی ٹھیس لگائی کہ اس نے اپنے اُوپر ہر آسائش حرام کر لی۔ سال بھر تک نہ لباس بدلا اور نہ پلنگ پر سویا۔ ہر وقت یہی خیال رہتا تھا کہ جلد سے جلد تیاری کر کے شکست کا بدلہ لے۔ چنانچہ دوبارہ کاروانِ فوج لے کر ہندوستان آیا۔ ۱۱۹۲ء میں اسی مقام پر پرتھوی راج سے دوبارہ جنگ کی، جہاں پہلے شکست کھا چکا تھا۔ پرتھوی راج اب کے تین لاکھ سپاہ لایا تھا۔ نیز تین ہزار جنگی ہاتھیوں کے علاوہ اس کے ساتھ ڈیڑھ دو سو راجا اور رئیس بھی تھے۔

غوری نے اپنی فوج کے پانچ حصّے کیے۔ خود بارہ ہزار جانباز ساتھ لے کر ایک اُونچی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے پورا میدانِ جنگ نظر آتا تھا۔ باقی چار لشکروں کو حکم دیا کہ وہ باری باری لڑیں۔ ایک لشکر تھک جائے تو دُوسرا اس کی جگہ لے لے۔ جب اس نے اندازہ کر لیا کہ دشمن کی ٹڈی دل سپاہ تھک گئی ہے تو خود بجلی کی طرح اس پر جا پڑا اور تھوڑی ہی دیر میں اسے تتر بتر کر دیا۔ ہزاروں مارے گئے، جن میں خود پرتھوی راج بھی تھا۔ دہلی اور اجمیر غوری کے قبضے میں آ گئے۔ تھوڑی ہی مدّت میں اس کے سالار بنگال تک جا پہنچے اور شمالی ہند میں وہ اسلامی سلطنت قائم ہوئی جو ۱۱۹۲ء سے ۱۸۵۷ء تک قائم رہی۔

اٹھارہ آدمی ملک فتح کرتے ہیں
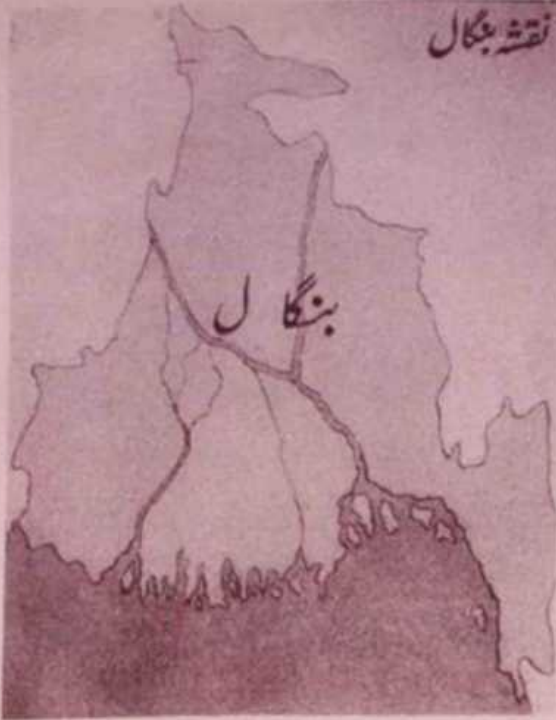
کیا آپ نے کبھی سُنا ہے کہ صرف اٹھارہ آدمیوں نے ایک بڑی حکومت کی راج دھانی پر قبضہ کر لیا ہو؟ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ بھی موجود ہے اور شاید ہی کسی دوسرے ملک کی تاریخ میں اس کی نظیر مل سکے۔ یہ محمد بن بختیار خلجی کا کارنامہ تھا جو ہندوستان کے پہلے مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک کا ایک سردار تھا۔

محمد بن بختیار کے کارنامے افسانوں سے بھی زیادہ عجیب ہیں۔ یہ ایک معمولی آدمی تھا۔ پہلے اس نے غزنی میں سپاہی بھرتی ہونے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوا۔ پھر دہلی پہنچا۔ یہاں بھی اُسے کوئی جگہ نہ مل سکی تو بدایوں کی طرف چلا گیا۔ اسلامی حکومت کی مشرقی سرحد پر تھوڑی سی زمین مل گئی اور اس نے اپنے طور پر کچھ سوار بھرتی کر لیے۔

۱۱۹۷ء میں دو سو سواروں کو لے کر اُس نے بہار پر ہلّہ بول دیا اور تھوڑے ہی دنوں میں پورے علاقے پر قابض ہو گیا۔ قطب الدین ایبک اس زمانے میں بادشاہ نہ تھا، بلکہ سُلطان محمد غوری کی جانب سے نائب السلطنت تھا۔ اُسے محمد بن بختیار کے اس کارنامے کا علم ہوا تو اُونچے درجے کا خلعت عطا کیا اور اس کو نئے فتح کیے ہوئے علاقے کا گورنر بنا دیا۔

اب محمد بن بختیار کو اپنی مردانگی اور کاردانی کے جوہر دکھانے کا پورا موقع ملا۔ اُس نے ایک فوج تیار کی اور بنگال کے راجا رائے لکشمن سین کی راج دھانی ندیا کا رُخ کر لیا۔ اُس کی شہرت پہلے ہی دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ نکلا تو اس تیزی سے چلا کہ ساری فوج پیچھے رہ گئی، صرف اٹھارہ آدمی ساتھ تھے۔ اسی طرح وہ ندیا کے دروازے پر پہنچ گیا۔ پہنچتے ہی شہر پر حملہ کر دیا اور فوج کا انتظار نہ کیا۔ اُسے یقین تھا کہ ساتھیوں کی تھوڑی تعداد کا خیال کوئی نہ کرے گا۔ سب یہی سمجھیں گے کہ بہت بڑی فوج لے کر آیا ہے۔ اسی لیے یوں بے باکانہ لڑ رہا ہے۔ یہ یقین بالکل درست نکلا۔

محمد بن بختیار نے راجا کے محل کی طرف پیشقدمی کی۔ راجا اس وقت کھانا کھا رہا تھا۔ باہر سے لوگوں کی چیخ پکار کان میں پہنچی تو حواس باختہ ہو کر محل کے پچھلے دروازے سے ننگے پاؤں اُٹھ بھاگا اور سنار گاؤں پہنچ کر دم لیا جو کسی زمانے میں بہت بڑا شہر تھا اور اب بھی خاصا مشہور ہے۔ ڈھاکے سے کوئی تیرہ میل کے فاصلے پر ہو گا۔ پہلے قدم پر شکست کے بعد راجا کے لیے کہیں جم کر لڑنے کی کیا صُورت تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں محمد بن بختیار بہار کی طرح پُورے بنگال پر بھی قابض ہو گیا اور اپنے پیچھے کارناموں کا ایک ایسا انبار چھوڑ گیا جو بڑے آدمیوں میں سے بہت تھوڑے انجام دے سکے۔

تاتاری سیل کا رُخ بدلتا ہے

تیرھویں صدی عیسوی ایشیا کے بڑے حصے کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً بڑی ہی مُصیبتوں اور آزمائشوں کی صدی تھی۔ اسی صدی میں تاتاریوں کا سیل منگولیا کے سنسان صحرائی علاقے سے نکلا، جس نے چنگیز خاں کی سرکردگی میں ان تمام خطّوں پر قتل و غارت کی بجلیاں گرادیں، جنھیں آج چینی ترکستان، رُوسی ترکستان، افغانستان، ایران، عراق، جنوبی و مغربی ایشیائے کوچک اور شام کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے سات صدیوں میں علم و فضل اور تہذیب و تمدن کے جو بڑے بڑے مرکز بنائے تھے، وہ زیادہ تر انھی علاقوں میں واقع تھے۔ ان کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ کتب خانے تباہ ہو گئے۔ دولت لُٹ گئی، باشندے موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ تاتاری بحرالکاہل کے قریب سے اُٹھے اور موت و ہلاکت برساتے ہوئے بحیرۂ رُوم کے کناروں تک پُہنچ گئے۔ کوئی بھی اس تیز و تند سیل کو روک نہ سکا۔ شام کو پامال کر چُکنے کے بعد اس سیل کا رُخ مصر کی طرف پھر گیا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اب یہ سیل شمالی افریقہ میں سے ہوتا ہوا اوقیانوس کے کناروں تک جا پہنچے گا، پھر ہسپانیہ میں داخل ہو کر یورپ کو بھی تہس نہس کر ڈالے گا۔

مصر کی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ ایوبیوں کی فرمانروائی ختم ہو چُکی تھی اور وہ جنگجو سردار برسرِکار آ گئے تھے، جنھیں بحری مملوک کہتے ہیں۔ ان میں تفرقہ پڑا ہوا تھا اور ان کے پاس اتنی فوج بھی نہ تھی جو تاتاریوں کے مقابلے پر آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی، لیکن جب قدرت کو کوئی کام لینا منظور ہوتا ہے تو اس کے لیے موزوں آدمی پیدا کر دیتی ہے۔ بحری مملوکوں میں سے

سیفُ الدّین قطز نے "الملک المظفّر" کا لقب اختیار کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

چنگیز کے پوتے ہلاکو نے قطز کو پیغام بھیجا کہ فوراً اطاعت اختیار کر لو، ورنہ پچھتاؤ گے۔ آنسو بہانے والوں پر ہم نے کبھی رحم نہیں کیا۔ آہ و فریاد سے ہمارے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ تم بھاگ کر جہاں جاؤ گے ہم تمہارے پیچھے پہنچیں گے اور کوئی سرزمین تمھیں پناہ نہ دے سکے گی۔

قطز نے فیصلہ کر لیا کہ وہ تاتاریوں سے لڑیگا، خواہ نتیجہ کچھ ہی ہو۔ چنانچہ اس نے پیغام لانے والوں کو قتل کرا دیا، تاکہ صُلح کا سوال ہی باقی نہ رہے۔ پھر جتنی فوج فراہم کر سکا، اُسے لے کر شام کی طرف روانہ ہو گیا، تاکہ دشمنوں کو اپنی مملکت سے باہر روکے۔ اس کا بیٹا رکنُ الدّین بیبرس ہراول کا کماندار تھا۔ شمالی فلسطین میں عین جالُوت کے مقام پر ۶ ستمبر ۱۲۶۰ء کو فیصلہ کُن لڑائی ہوئی۔ تاتاریوں کی فوج بہت زیادہ تھی اور منگولیا سے شام تک وہ برابر فتح و ظفر کے پھریرے اُڑاتے چلے آ رہے تھے۔ قطز کو پُورا احساس تھا کہ مقابلہ آسان نہیں۔ اس نے ایک نیک دِل مسلمان کی طرح رو رو کر بارگاہِ الٰہی میں دعائیں کیں اور اپنے تمام سالاروں اور رفیقوں سے بھی کہہ دیا کہ اس مقام پر جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ رکنُ الدّین بیبرس بڑی مردانگی سے لڑا، پھر قطز نے ایک زبردست یورش کی، جس میں اس کا گھوڑا مارا گیا اور وہ خود موت کے مُنہ میں پہنچ گیا۔ عین اس حالت میں ایک سپاہی نے اپنا گھوڑا پیش کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں تاتاریوں کا سالارِ اعظم مارا گیا اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بہت بڑی تعداد میں تہ تیغ ہُوئے۔ اس شکست نے تاتاریوں کے دل میں اِتنا ہراس پیدا کر دیا کہ وہ دمشق اور دُوسرے شہروں سے بھی نکل گئے۔

عین جالوت کی لڑائی اس لحاظ سے تاریخ میں بے حد اہم ہے کہ تیس برس کی مسلسل فتوحات کے بعد تاتاریوں کی یہ پہلی شکست تھی۔ ان کے سیل کا رُخ عین جالوت سے پلٹا اور شام و فلسطین کے علاوہ مصر، شمالی افریقہ اور مغربی یورپ بھی ان کی ترکتاز سے محفوظ ہو گئے اور تاتاریوں کو پھر کبھی آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

راشن
کا
بہترین نظام جاری ہوتا ہے

حکومت کا ایک بہت بڑا فرض یہ ہے کہ جن چیزوں کی ضرورت عوام کو ہوتی ہے، ان کا انتظام ایسے اچھے طریقے سے کرے کہ کسی کو ان کے حاصل کرنے میں کوئی تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔ کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں سے کوئی انسان بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اگر ان کے نرخوں کی پُوری نگرانی نہ کی جائے تو سرمایہ دار لوگ نفع کے لالچ میں عوام کے لیے مُصیبت بن جاتے ہیں۔

عوام کو اس قسم کی تکلیفوں سے بچانے کے لیے حکومتیں بعض اَوقات راتب بندی کا نظام جاری کر دیتی ہیں۔ ہندوستان میں یہ نظام سب سے پہلے سُلطان علاؤ الدین خلجی نے جاری کیا تھا جو حد درجہ کامیاب رہا اور آج تک ایسی کامیابی کی مثال کوئی بھی حکومت پیش نہ کر سکی۔ اکثر یہی دیکھا گیا کہ منتظموں اور کارکنوں کی نالائقی یا سہل انگاری کے باعث راتب بندی عوام کے لیے پریشانیوں ہی کا باعث بنتی رہی۔

سُلطان علاؤ الدّین نے تمام ضروری جنسوں کی مناسب قیمتیں مقرر کر دیں۔ جگہ جگہ غلّے کے سرکاری ذخیرے بنوا دیئے۔ ہر ضروری مقام پر منڈیاں قائم کر دیں، ہر منڈی کا انتظام ایک قابل اور دیانتدار منتظم کے حوالے کیا۔ سُلطان نے ہر مقام پر اپنے جاسُوس مقرر کر رکھے تھے۔ اگر کوئی شخص نرخ یا تول میں ذرا سی بھی بددیانتی کرتا تو فوراً سُلطان کو اطلاع پہنچ جاتی اور مجرم کو سخت سزائیں دی جاتیں۔ ہر محلّے کے لیے الگ الگ بنیئے مقرر کر دیئے گئے تھے جو

تمام اہلِ محلّہ کو سرکاری نرخ پر غلّہ بہم پہنچاتے تھے۔ کسی کو جائز ضرورت سے زیادہ غلّہ لینے کا حق نہ تھا اور ضرورت کو ٹھیک ٹھیک پُورا کرنے کی ذمہ داری خود سُلطان نے اُٹھا رکھی تھی۔

سرکاری ذخیروں میں بھی جنسیں برابر جمع رہتی تھیں اور بنجارے بھی غلّہ برابر منڈیوں میں پہنچاتے رہتے تھے۔ جونہی کسی منڈی میں غلّہ کم ہونے لگتا تو پاس کے سرکاری ذخیرے سے اُسے فوراً پُورا کر دیا جاتا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ خود شاہی ضرورت کی چیزیں بھی عام لوگوں کی طرح منڈیوں سے مقررہ نرخوں پر خریدی جاتی تھیں۔ گویا عوام، امرا اور بادشاہ میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا۔ اسی طرح کپڑے، گھی، دالوں، شکر اور دُوسری چیزوں کے نرخ مقرّر کر دیئے گئے تھے۔ مُلتانی تاجروں کو بیس لاکھ روپے کی رقم سرکاری خزانے سے پیشگی دے دی گئی کہ وہ دُور دُور سے ہر قسم کا کپڑا خرید کر سرکاری منڈیوں میں پہنچاتے رہیں۔ تمام تاجروں کے نام باقاعدہ رجسٹر میں درج ہوتے تھے۔

اس انتظام کا نتیجہ یہ ہُوا کہ نہ قحط اور خشک سالی میں غلّے یا دُوسری خوردنی چیزوں کی کمی ہوئی اور نہ فراوانی اور بہتات کے زمانے میں نرخ بدلنے پڑے۔ ایک موقع پر منڈی کے منتظم نے خشک سالی کے مدِّنظر تجویز پیش کی کہ غلّے کے نرخ میں اضافہ کر دیا جائے۔ سلطان نے اُسے اکّیس ضرب تازیانوں کی سزا دی۔

مؤرّخوں نے لکھا ہے کہ راتب بندی کا یہ نظام اس وجہ سے کامیابی کا اعلیٰ درجہ حاصل کر سکا کہ منڈیوں کے لیے جو ضابطے مقرّر ہو چکے تھے، ان کی پابندی میں کسی سے رُو رعایت نہ برتی جاتی تھی، نیز جو منتظم اور کارکُن مقرّر کیے جاتے تھے، وہ بڑے دیانت دار ہوتے تھے اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں بہت مستعد تھے۔ حق یہ ہے کہ ضابطوں سے اِدھر اُدھر ہونے میں سُلطانی دار و گیر کا خوف رہتا تھا اور سُلطان کی یہ حالت تھی کہ قانون توڑنے والے کسی بھی شخص کو معاف نہ کرتا تھا، خواہ وہ کتنا ہی بڑا امیر یا اس کا قریبی رشتہ دار ہی ہوتا۔
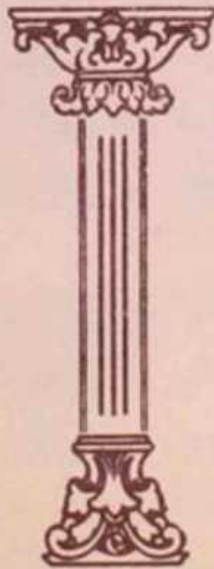
مغرب مشرق سے شکست کھاتا ہے

عثمانی ترک، سلطان اورخان (۱۳۲۶ - ۱۳۵۹ء) کے زمانے میں یورپ پہنچ گئے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے۔ اہلِ یورپ نے دو تین مرتبہ بڑی قوت جمع کر کے مقابلہ کیا۔ پہلا زبردست معرکہ سلطان مراد اوّل کے ساتھ کسووا کے میدان میں پیش آیا۔ یورپ نے شکست فاش کھائی۔ اس کے بعد دس سال اطمینان سے گزر گئے۔ سُلطان بایزید یلدرم کے زمانے میں پھر یورپ کے اندر ایک خاص جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، پولینڈ، آسٹریا، ہنگری اور بلقانی علاقوں کے بڑے بڑے رئیسوں، بہادروں اور شہزادوں نے فیصلہ کیا کہ وہ سب مل کر ترکوں کو یورپ سے باہر نکالیں گے۔ چنانچہ شاہِ ہنگری کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی فوج تیار ہو گئی۔

سلطان بایزید چار سال سے ایشیائے کوچک کے انتظامات میں مصروف تھا اور اپنے یورپی علاقوں میں جانے کی اُسے فرصت ہی نہ ملی تھی۔ اہلِ یورپ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور سلطنتِ عثمانیہ کے قصبوں کو جلاتے اور برباد کرتے آگے بڑھے۔ اصل میں اُن کے پیشِ نظر لڑائی نہ تھی، بلکہ ایک جوشِ انتقام تھا جس نے انھیں دیوانہ بنا رکھا تھا۔ انھیں اپنے بہادروں کی شجاعت اور اپنی فوج کی کثرت پر بڑا ناز تھا۔ مشہور ہے کہ پیش قدمی کرتے ہوئے ان کی نظریں اپنی تعداد کی زیادتی پر پڑتی تھیں تو پکار اُٹھتے تھے کہ اگر آسمان بھی ٹوٹ پڑے تو ہم اپنے نیزوں کی نوکوں پر اسے اُٹھائے رکھیں گے اور زمین پر نہ گرنے دیں گے۔

بایزید کو اہلِ یورپ کے بھاری جتھے کی اطلاع ملی تو بجلی کی طرح تڑپ اُٹھا اور طوفان کی تیزی سے اپنے یورپی دارالحکومت ایڈریانوپل پہنچ گیا۔ اس اثنا میں نکوپوس کے ترک حاکم نے اہلِ یورپ کا زبردست مقابلہ کر کے بایزید کے لیے تھوڑی سی فوج

تیار کر لینے کی مہلت مہیا کردی۔ اس نے کچھ فوج آگے بھیج دی اور خود پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔

اہلِ یورپ کو خبر ملی تو بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے سے آگے بڑھ بڑھ کر مقابلے کے دعوے کرنے لگے۔ شاہِ ہنگری کو ترکوں کے طریقِ جنگ کا علم تھا کہ وہ ابتدا میں بے قاعدہ دستوں کو آگے بھیجتے ہیں۔ اس طرح دشمن کی قوت یا صلاحیتِ جنگ کا پورا اندازہ کر لیتے ہیں تو باقاعدہ فوج کا حملہ ہوتا ہے۔ شاہِ ہنگری نے ساتھیوں کو بہت روکا کہ بے قاعدہ فوج کے مقابلے میں اپنی قوت ضائع نہ کریں، مگر اس کی کون سنتا تھا۔ ہر یورپی بہادر یہی کہتا تھا کہ اگر مجھے آگے رہنے کا موقع نہ ملا تو میری بہادری کی قدر و قیمت زائل ہو جائے گی۔

۲۵ رستمبر ۱۳۹۶ء کو نکوپولس سے چار میل جنوب میں لڑائی ہوئی۔ جیسا کہ شاہ ہنگری کا خیال تھا، یورپی بہادر اپنا سارا جوش بے قاعدہ ترک دستوں کے مقابلے میں صرف کر بیٹھے۔ بے قاعدہ دستے مقررہ منصوبے کے مطابق اِدھر اُدھر بکھر گئے تو یورپی جیش آگے بڑھے۔ سامنے سلطان باقاعدہ فوج کی صف بندی کیے کھڑا تھا۔ اُدھر سلطان سے لڑائی شروع ہوئی، اِدھر بے قاعدہ دستوں نے از سرِ نو جمع ہو کر اہلِ یورپ کے عقب سے حملہ کر دیا۔ اس طرح چکی کے دو پاٹوں میں بڑے بڑے دلیروں اور جوانمردوں کی بہادری چنوں کی طرح پس گئی۔ ہزاروں کھیت رہے باقی گرفتار ہو گئے جن میں پچیس کے قریب شہزادے تھے۔

بایزید انھیں ایشیائے کوچک لایا۔ پھر کہا کہ اگر مجھے تم لوگوں کا ڈر ہوتا تو عہد و پیمان لیتا کہ دوبارہ میرے ساتھ جنگ نہ کرنا، لیکن میں تم سب کو دعوتِ عام دیتا ہوں کہ اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ نئے سرے سے فوجیں تیار کرو۔ راستے کے ہر شخص کو اپنے ساتھ ملاتے جاؤ۔ جب خوب تیار ہو جاؤ تو مجھے پیغام بھیج دینا۔ جہاں کہو گے تمھارا شوقِ مقابلہ پورا کرنے کے لیے پہنچ جاؤں گا۔

پھر ان لوگوں میں سے کوئی بایزید کے مقابلے پر نہ آیا۔ نکوپولس کی لڑائی اس وجہ سے حد درجہ اہم ہے کہ اگرچہ اس کے بعد سلطنتِ عثمانیہ پچاس سال تک مصیبتوں میں پھنسی رہی، لیکن اہلِ یورپ کو اس اثنا میں لڑائی کا خیال کبھی نہ آیا۔

ہندو دھرم اِسلامی اثر قبول کرتا ہے

مختلف قوموں اور مذہبوں کو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رہنے سہنے کا موقع ملتا ہے تو جس میں قوت اور تاثیر زیادہ ہوتی ہے وہ دُوسروں پر اپنا اثر ڈالتا ہے اور یہ اثر مختلف شکلوں میں نمایاں ہوتا ہے مسلمان ہندوستان میں آئے تھے تو کُچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں کے پُرانے مذہبی اور تمدّنی نظاموں کی اصل صُورت کیا تھی، لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ لمبی مدّت گزر جانے کے باعث ان میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، مثلاً مورتی پُوجا عام تھی۔ پروہتوں نے اپنے طور پر جو رسمیں جاری کر دی تھیں، ان کی پابندی پر بہت زور دیا جاتا تھا اور مذہب کی رُوح کے مطابق اپنی زندگی سنوارنے کا کسی کو خیال نہ تھا۔ ذات پات کے بندھنوں نے انسانوں کو سینکڑوں گروہوں میں بانٹ رکھا تھا۔ اچھے اعمال اور اچھے اخلاق پر کسی کی نظر نہ تھی۔ بڑائی چھٹائی کسی خاص خاندان یا برادری میں پیدا ہونے پر موقوف تھی۔ چھوت چھات کی وبا ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بعض مقامات پر تو یہ حالت تھی کہ جن لوگوں کو اچھوت سمجھا جاتا وہ ساٹھ ساٹھ گز تک برہمنوں سے دُور رہنے پر مجبور تھے۔

اِسلام کی تعلیم بہت سادہ تھی۔ اس میں اُونچ نیچ کی کوئی تمیز نہ تھی۔ سب انسانوں کو برابر سمجھا

جاتا تھا اور انسان کی برتری کا معیار یہ نہ تھا کہ وہ کس رنگ کا ہے، کس خاندان میں پیدا ہوا ہے یا کتنا دولت مند ہے۔ صرف پاکیزہ اخلاق اور نیک اعمال کو بڑائی کی بنیاد مانا جاتا تھا۔ باہمی محبت، رواداری اور بے تعصبی پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ توحید کا عقیدہ اسلام کی روح تھا۔ مسلمان بزرگوں نے جگہ جگہ مرکز قائم کر دیے اور وہ نرم دلی، شفقت اور اخلاق سے اسلامی تعلیم کی اشاعت کرتے رہے۔

آہستہ آہستہ اس کا اثر غیر مسلموں پر بھی پڑنے لگا۔ ان میں کئی مصلح (ریفارمر) پیدا ہوئے، جن کی تعلیم میں اسلامی اثرات موجود ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسی دین حق کی روشنی میں انھوں نے اپنے مذہب کی تعلیمات کو نیا لباس پہنا دیا۔ ان مصلحوں میں سے رامانند، چیتنیا اور گرونانک کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

رامانند چودھویں صدی میں گزرا ہے۔ اس نے بھگتی کی تحریک چلائی۔ وہ ذات پات کے جھگڑوں سے سخت بیزار تھا۔ سب کو یہی تعلیم دیتا تھا کہ ایک خدا کی عبادت کرو، باہم محبت اور اتفاق سے رہو۔ تعصب اور تنگ نظری بہت بری چیز ہے۔ چیتنیا نے بھی چھوت چھات اور ذات پات کو بالکل چھوڑ دیا تھا۔

گرونانک سے سکھ دھرم کی بنیاد پڑی۔ گروجی کی زندگی کا بڑا حصہ مسلمان درویشوں کی صحبت میں بسر ہوا۔ ایک ہندو مؤرخ نے لکھا ہے کہ گرونانک اور نام دیو کی تعلیمات میں اسلام کا اثر صاف نمایاں ہے۔ یہ بزرگ ذات پات، چھوت چھات، بہت سے خداؤں کے عقیدے اور بت پرستی کی سخت مذمت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایک خدا پر ایمان لاؤ، عمل میں اخلاص برتو اور پاکیزہ زندگی بسر کرو۔ ان کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ خدا ہندوؤں، مسلمانوں، چنڈالوں اور برہمنوں سب کا مالک ہے۔ اس کی نظر میں سب برابر ہیں۔ جو شخص سچائی کے راستے کا طلب گار ہے اسے چاہیے کہ مذہبی رتبوں اور ذات پات کی زنجیر کو توڑ ڈالے۔

یہ پاکیزہ اثرات اسلام نے پیدا کیے، جن سے آہستہ آہستہ ہندویت کی ساکن سطح میں بھی جنبش رونما ہوئی اور بعد میں جتنی اصلاحی تحریکیں بروئے کار آئیں ان سب میں ان اثرات کا پرتو موجود تھا، یہاں تک کہ سوامی دیانند کی تحریک بھی انھی اثرات کا کرشمہ تھی، اگرچہ سوامی جی آخری دور میں سیاسی مقاصد کی خاطر مسلمانوں کے مخالف بن گئے۔

ہندوستان میں مُغلیہ سلطنت قائم ہوتی ہے

ہندوستان میں مُغلوں کی سلطنت دُنیا کی چند بڑی بادشاہیوں میں گنی جاتی ہے۔ اتنے وسیع اور زرخیز علاقے میں انتہائی جاہ و جلال کے ساتھ حکمرانی کا سکّہ چلانے کا موقع بہت کم خانوادوں کو مِلا۔ ایسی شاندار یادگاریں بھی بہت کم بادشاہوں نے چھوڑیں، جیسا دہلی کا لال قلعہ، دیوانِ خاص اور دیوانِ عام یا آگرے کا تاج محل اور موتی مسجد یا لاہور و کشمیر کے شاندار باغ ہیں۔ مغل سوا تین سو سال تک ہندوستان کے جسم میں زندگی کی رُوح بنے رہے۔ چپّے چپّے کی پیشانی پر اپنے نہ مٹنے والے نشان قائم کیے۔ زمین کے بہت سے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک عظیم الشّان ملک بنایا۔ علم و فضل، تجارت و زراعت، صنعت و حرفت اور تہذیب و تمدّن میں اسے عالمگیر شہرت عطا کی۔ اس سلطنت کی بُنیاد بابر نے رکھی تھی۔

بابر نے پانی پت کی جنگ میں، جو اپریل ۱۵۲۶ء میں ہوئی، دہلی اور آگرے پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن آگرے کے پہلو میں راجپوت بپھرے بیٹھے تھے۔ ان کا کانٹا نکالے بغیر اطمینان کا سانس لینا محال تھا اور تخت کے پائے مضبوطی سے نہ جم سکتے تھے۔ راجپوتوں کا سردار رانا سانگا تھا، جو خود ہندوستان پر چھا جانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس فوج اتنی زیادہ تھی کہ بابر کے لیے مُقابلے سے عہدہ برآ ہونا بہ ظاہر بہت مشکل نظر آتا تھا، بلکہ شکست کی حالت میں راجپوتانے سے سرحد تک زندہ واپس جانا بھی ممکن نہ تھا۔

رانا سانگا نے بہت جلد سوا لاکھ راجپوتوں کو لڑنے مرنے کے لیے تیار کر لیا اور وہ آگرے کی جانب بڑھا۔ بابر کے ساتھ صرف تیرہ ہزار سپاہی تھے۔

آگرے سے تیئیس میل پر سیکری کے قریب مارچ ۱۵۲۷ء میں جنگ ہوئی۔ سپاہ کی کمی نے بابر کے ساتھیوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اس نے حالات کا پورا اندازہ کر کے اپنے آدمیوں کے رُوبرُو ایک ایسی تقریر کی جس کا ایک ایک لفظ تاثیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے کہا: "بہادرو! جو شخص اس دنیا میں آتا ہے، اس کے لیے موت سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں، وہ ضرور مرے گا۔ سوچو ذلّت کی زندگی سے عزّت کی موت کتنی بہتر ہے۔ ہم مسلمانوں پر خدا کا یہ بہُت بڑا احسان ہے کہ اس کی راہ میں جانیں دیں تو شہید بنیں، فتح حاصل کریں تو غازی کہلائیں۔ آؤ سب یک دل اور یک زبان ہو کر حلف اُٹھائیں کہ جب تک دم میں دم ہے، میدان سے پیچھے نہ ہٹیں گے اور عزّت کی موت سے منہ نہ موڑیں گے۔

یہ تقریر سُنتے ہی سب کے حوصلے تازہ ہو گئے۔ لڑائی شروع ہوئی تو بابر کے ساتھی اس ہمت و جوانمردی سے لڑے کہ دوپہر تک غنیم کے قدم اُکھڑنے لگے۔ پھر خود بابر سواروں کو لے کر بجلی کی طرح راجپوتوں پر گرا اور ان کے ٹڈی دل کو تتر بتر کر کے رکھ دیا۔ بہت سے راجپوت مارے گئے، البتہ رانا سانگا جان بچا کر بھاگ گیا۔ اس فتح کی یادگار میں بابر کے پوتے اکبر نے مقام جنگ پر فتح پور آباد کیا تھا جو اب تک موجود ہے۔

راجپوتوں کو پھر سر اُٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت مستحکم ہوگئی۔ اکبر سے سلطنت کے پھیلنے کا آغاز ہوا یہاں تک کہ وہ سائبان کی طرح پُورے ہندوستان پر چھاگئی۔

بابر اس فتح کے بعد ساڑھے تین سال زندہ رہا۔ بڑی عجیب شخصیت کا مالک تھا جفاکش ایسا کہ ایک ایک سو میل گھوڑے کی پیٹھ پر نکل جاتا اور ذرا دیر کے لیے بھی نہ رُکتا۔ رحم دل اتنا کہ جانی دشمن بھی سامنے آجاتا تو خوشی خوشی معاف کر دیتا۔

رفاہِ عامہ کا سکّہ چلتا ہے

دُنیا میں ایسے بادشاہ بھی گزرے ہیں جو عمر بھر تلواریں چلاتے رہے، بڑے بڑے علاقے فتح کیے اور عظیم الشّان سلطنتوں کی بنیاد رکھی۔ آج تاریخ کے صفحات سے باہر ان کے کسی بھی کارنامے کا کوئی نشان نہیں ملتا اور ایسے بادشاہ بھی گزرے ہیں جنھوں نے اپنے عہدِ حکومت کا زیادہ حصّہ خدا کے بندوں کی راحت و آسائش اور فلاح و بہبود میں گزار دیا اور اس وجہ سے عالمگیر شہرت پائی۔ ان کے کارنامے اب تک ملکوں کے نظم و نسق کا جزو بنے ہوئے ہیں۔ شیر شاہ سُوری آخری قسم کے بادشاہوں میں سے تھا۔

وہ ایک معمولی سردار کا بیٹا تھا۔ اپنی دانائی، دُور اندیشی اور جواںمردی سے ہندوستان کے تخت کا مالک بن گیا۔ اُس کی سلطنت شمالی ہند میں سِندھ سے بنگال تک پھیلی ہُوئی تھی۔ راجپوتانہ بھی اس میں شامل تھا۔ اگرچہ صرف پانچ سال بادشاہ رہا، لیکن اس تھوڑی سی مُدّت میں بھی اِتنا کام کر گیا کہ دُوسروں کو شاید ایک سو سال میں بھی اس کی توفیق نصیب نہ ہوتی۔

شیر شاہ نے مالگذاری کے پُورے نظام کو نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ ہر فصل پر کاشت کیے ہوئے رقبے کی پیمائش ہوتی اور اس کے مطابق مالیہ تجویز کیا جاتا۔ مالیے کے قاعدے ایسے بنا دیئے کہ کوئی سرکاری کارکُن کسی کاشتکار کو تنگ نہ کر سکے۔ کاشتکاروں کو حق دے دیا کہ چاہیں تو مالیہ نقد ادا کریں یا اس کے عوض غلّہ دے دیں۔ کاشتکاروں کو وہ سلطنت میں ریڑھ کی ہڈی قرار دیتا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے نظام مالگذاری میں اکبر نے کچھ ترمیمات کیں اور وہی نظام اب تک ہمارے ملک میں جاری ہے۔

اس زمانے میں فوجی خدمات انجام دینے والوں کو سواروں کی تعداد کے مطابق جاگیریں دی جاتی تھیں۔ وہ لوگ جاگیروں سے فائدہ اُٹھاتے اور ضرورت کے وقت اِدھر اُدھر سے گھوڑے جمع کر کے مقرّرہ تعداد پُوری کر لیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ فوجی خدمت کا کوئی اچھا طریقہ نہ تھا۔ شیر شاہ نے گھوڑوں کے داغ دینے کا طریقہ رائج کیا۔ داغ کے بغیر کسی گھوڑے یا اس کے سوار کو تنخواہ نہ ملتی تھی۔

ملک بھر میں امن قائم کر دیا۔ اگر کہیں چوری، ڈاکے یا خون کی واردات ہو جاتی تو اردگرد کے تمام مقدموں اور چودھریوں کو گرفتار کر لیا جاتا اور جب تک وہ اصل مجرموں کو پکڑوا نہ دیتے، رہائی نہ پاتے۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ وہ لوگ خود اپنے علاقوں کی پُوری حفاظت کرتے۔

شیر شاہ نے پُورے ملک میں سڑکوں کا جال بچھادیا، تاکہ مُسافروں اور سامان لانے، لے جانے والوں کو سہولت رہے۔ ان میں سے تین شاہراہیں بہت مشہور ہیں۔ ایک بنگال سے پنجاب کی شمالی حد تک، جسے جرنیلی سڑک کہتے ہیں، دُوسری آگرے سے چتوڑ تک اور تیسری لاہور سے مُلتان تک۔ ان شاہراہوں کے دونوں کناروں پر سایہ دار اور میوے دار درخت لگوائے۔ ہر پڑاؤ پر سرائیں تعمیر کرائیں۔

سراؤں میں پانی کے لیے کنوئیں تھے۔ ہندوؤں کی عبادت کے لیے مندر، مُسلمانوں کی عبادت کے لیے مسجدیں بنوائیں۔ انھی سراؤں میں ڈاک کی چوکیاں مقرّر کر دی تھیں۔ جگہ جگہ بھروسے کے وقائع نگار تھے، جو سلطنت کے ہر حصّے کی ضروری خبریں براہِ راست بادشاہ کو پہنچاتے تھے جس سے قابلِ توجہ واقعے کا بادشاہ کو جلد سے جلد علم ہو جاتا تھا

خُشکی پر جہاز روانہ ہوتے ہیں

مشرقی رُومی سلطنت کا مرکز قسطنطنیہ موقع اور محل کے لحاظ سے اتنا مستحکم تھا کہ اسے فتح کر لینا ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ سُلطان محمّد عثمانی نے ۱۴۵۳ء میں اسے مسخر کیا اور "فاتح" کا پُرفخر لقب اس کے نام کا جزو بن گیا۔ مسلمان اس سے پیشتر کم و بیش دس مرتبہ زبردست حملے کر چکے تھے، وہ شہر کی دیواروں تک بھی پہنچتے رہے۔ اپنی مرضی کے مطابق شرطیں بھی منواتے رہے، لیکن شہر ان کے قبضے میں نہ آیا۔

قسطنطنیہ کے جنوب میں بحیرۂ مارمورا واقع ہے، پھر آبنائے باسفورس سے پانی کی ایک شاخ نکل کر چار میل اندر چلی گئی ہے جسے "شاخ زریں" کہتے ہیں۔ اس طرح قدرت نے اس کی تین طرفوں میں حفاظت کے ایسے انتظامات کر دیے تھے کہ پُرانے زمانے میں اُنھیں توڑنا آسان نہ تھا۔ خشکی کی طرف سے حملہ ہو سکتا تھا، لیکن ادھر یکے بعد دیگرے تین فصیلیں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ زبردست بیڑے کے ساتھ یورش ممکن تھی، مگر اہلِ قسطنطنیہ نے شاخ زریں کے دہانے پر مضبوط فولادی زنجیریں اس ترکیب سے باندھ دی تھیں کہ کوئی اجنبی جہاز ان سے گزر کر اندر نہ جا سکتا تھا۔

سُلطان محمد فاتح پچاس ہزار سوار، بیس ہزار پیادے اور بھاری توپیں لے کر ۶؍اپریل ۱۴۵۳ء کو قسطنطنیہ کے سامنے پہنچ گیا اور شہر پر گولہ باری شروع کر دی۔ فصیلوں کو توڑنے کے جتنے طریقے اس زمانے میں رائج تھے، وہ سب استعمال کیے، لیکن کامیابی کی کوئی صُورت پیدا نہ ہوئی۔ اس کے پاس بیڑا تھا جسے باسفورس کی سمت سے شاخ زریں میں پہنچانے کا کوئی بندوبست ہو سکتا اور شہر پر دو طرف سے حملہ ہو جاتا تو فتح کی اُمید تھی، خصوصاً

اس لیے کہ شاخِ زریں کی طرف فصیل نہ زیادہ اُونچی تھی اور نہ خندق مضبُوط تھی، لیکن شاخ زریں کے دہانے سے گزرنے کی کوئی تدبیر ذہن میں نہ آتی تھی۔

سوچتے سوچتے اسے ایک عجیب تجویز سُوجھی۔ اس نے باسفورس سے شاخ زریں تک ایک خندق کُھدوائی۔ اس میں لکڑی کے صاف تختے بچھوا کر ان پر خوب چربی لگوادی، تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ چکنے ہوجائیں۔ پھر اپنے اسّی جہاز باسفورس سے خشکی پر چڑھا لیے اور چکنے تختوں پر سے دھکیلتے ہُوئے انھیں شاخ زریں کے اندر پہنچا دیا۔ ان جہازوں پر سپاہی بٹھا دیے گئے اور توپیں بھی نصب کر دی گئیں۔ اچانک یہ بیڑا خشکی میں سے گُزرتا ہوا شاخ زریں کے اندر پہنچ گیا اور ادھر سے گولوں کا مینہ برسنے لگا تو اہلِ شہر ہمت ہار بیٹھے۔ وہ بچاؤ کے لیے شاخ زریں کی طرف پلٹے تو خشکی کی جانب سے سُلطانی سپاہ نے فصیلیں توڑ کر اندر داخل ہونے کا راستہ صاف کر لیا۔

۲۸ مئی کو یقین ہوچکا تھا کہ اب اہلِ شہر میں مقابلے کی سکت نہیں رہی۔ ۲۹ مئی کی صبح کو نماز کے بعد سُلطان نے عاجزی سے بارگاہ باریتعالیٰ میں دُعائیں کیں۔ پھر فوج کے مختلف حصّے شہر میں داخل ہوگئے۔ خود سُلطان بھی دس ہزار سواروں کے ساتھ اندر گیا۔ ظہر کی نماز شہر میں ادا کی اور قسطنطنیہ کی فصیل پر ہلالی جھنڈا نصب ہوگیا۔

یہ واقعہ مختلف وجوہ سے بے حد اہم ہے۔ مشرقی رُومی سلطنت کا نشان ہمیشہ کے لئے مِٹ گیا، جسے یورپ کے اندر پیش قدمی کرنے والی ترکی فوجوں کے پہلو میں خنجر کی حیثیت حاصل تھی اور تھوڑی ہی مدّت میں فتح مند ترکوں کے پھریرے ویانا کی دیواروں تک پہنچ گئے۔ قسطنطنیہ مسیحیت کی جگہ اسلام کا مایۂ ناز مرکز بن گیا اور پانسو سال تک اُسے خلافت کی تخت گاہ ہونے کا شرف حاصل رہا۔ ایشیا اور افریقہ لمبی مُدّت کے لیے یورپ کے خطرے سے محفوظ ہوگئے۔ پُرانی دُنیا میں جنگی نقطۂ نگاہ سے جتنے مقامات اہم تھے، وہ سب مُسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔ قسطنطنیہ اس سلسلے کا آخری مقام تھا۔ بحیرۂ اسود، آبنائے باسفورس، مارمورا، درہ دانیال، بحیرۂ رُوم اور بحیرۂ قلزم اسلامی سمندر بن گئے۔

ترکی ایک عظیمُ الشّان بیڑا تیار کرتا ہے

مشرق اور مغرب کے درمیان بحری تجارت صدیوں تک مُسلمانوں کے ہاتھ میں رہی۔ وُہی تھے جنھوں نے جان پر کھیل کر اتھاہ سمندروں کے سینے چیرے اور جہازوں کے لیے راستے بنائے۔ وہی تھے جنھوں نے سمندر کے راستے چین پہنچ کر مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملائے۔ ایک عرب مّلاح ہی تھا جس نے کولمبس کو "نئی دُنیا" کا راستہ دکھایا۔ ایک عرب ملاح ہی تھا جس نے واسکوڈی گاما کو افریقہ کے مشرقی ساحل سے ہندوستان پہنچایا۔

قومی اور انسانی خدمت کا کون سا دائرہ ہے جس میں وہ سب سے آگے نکل جانے کے لیے سرگرم عمل نہ ہوئے! خیرالدین باربروسا کو دیکھو، اس نے سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں شہرت حاصل کی۔ اس وقت فرنگستان کے بحری قزّاقوں نے بحیرۂ رُوم کے شمالی ساحل پر جا بجا اڈے بنا رکھے تھے اور تجارتی جہازوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی یورپی حکمرانوں کی مدد سے شمالی افریقہ کی اسلامی آبادیوں پر بھی ہلّے بول دیتے تھے۔ خیرالدّین اور اس کے بھائی نے کسی خاص امداد کے بغیر تنہا ان کا مقابلہ کیا اور ان کی قوّت توڑ کر رکھ دی۔ مسلمانوں کو ہسپانیہ سے نکال دیا گیا تھا تو وہ یا ساحلی علاقوں میں مصیبتیں اُٹھا رہے تھے یا مختلف جزیروں میں پہنچ گئے تھے۔ یہاں ان کے لیے زندگی اجیرن ہو رہی تھی۔ خیرالدین ہی تھا جس نے ہمّت کی اور دشمنوں سے لڑ بھڑ کر ہزاروں مسلمانوں کو شمالی افریقہ پہنچایا، تاکہ وہ اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ جب سلیمان اعظم کو ایک عظیم الشّان بیڑا بنانے کا خیال پیدا ہُوا تو خیرالدین ہی کو اس مقصد کے لیے چُنا اور اسے "کپتان پاشا" کا خطاب عطا کیا۔

خیرُالدین کا اصلی نام خضر تھا۔ یہ ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کے قریب ایک چھوٹے سے جزیرے میں پیدا ہُوا۔ اس کے والد یعقوب نے چند کشتیاں بنا رکھی تھیں جن میں تجارتی مال لاد کر جا بجا پہنچاتا۔ والد کی وفات کے بعد خیرالدین اپنے تین بھائیوں کے ساتھ اُجرت پر کشتیاں ہی چلاتا رہا۔ پھر انھوں نے چھوٹے چھوٹے جہازوں کا بندوبست کر کے تونس میں سکونت اختیار کر لی جہاں فرنگستانی قزّاقوں کے مقابلے میں غیر فانی شہرت حاصل کی۔ ۱۵۳۰ء میں سلطان سلیمان نے اسے قسطنطنیہ بلا لیا۔

چار سال کی محنت کے بعد اس نے اپنی نگرانی میں ایک بیڑا تیار کرایا اور اسے لے کر ۱۵۳۴ء میں آبناؤں سے گزرتا ہُوا بحیرۂ رُوم میں جا پہنچا۔ وہ آبنائے سینا تک بڑھا چلا گیا، لیکن کسی کو مقابلے کی ہمّت نہ ہوئی۔ اس زمانے میں

یورپ والے انڈریا ڈوریا کو بہت بڑا بحری کمانڈر مانتے تھے۔ چنانچہ کئی بادشاہوں نے ایکا کر کے ایک بیڑا ڈوریا کی کمان میں دے دیا کہ خیرالدّین کا مقابلہ کرے۔ اس وقت عثمانی فوجیں بلقان میں لڑ رہی تھیں۔ خیرالدین نے جب سُنا کہ ڈوریا مقابلے کے لیے نکلا ہے تو وہ ایک سو پینتیس جہازوں کا بیڑا لے کر بے تکلفی سے بحیرۂ ایڈریاٹک میں داخل ہوگیا، جہاں ڈوریا دبکا بیٹھا تھا۔ خیرالدین نے فوج بلقانی ساحل پر اُتار دی، مگر ڈوریا کو مقابلے پر آنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

اس زمانے میں ترکی بیڑے کی دھاک ہر طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ ۱۵۳۹ء میں فرانس کے بادشاہ نے سلیمان سے امداد طلب کی۔ سلطان نے خیرالدین کو بھیج دیا۔ وہ اٹلی کے ساحلی علاقوں پر گولے برساتا ہُوا مرسائی[1] پہنچ گیا جو جنوبی فرانس کی مشہور بندرگاہ ہے۔ شاہِ فرانس نے حکم دے دیا کہ جب تک ترکی بیڑا مرسائی میں موجود ہے، کسی گرجے میں گھنٹہ نہ بجایا جائے۔ ۱۵۴۶ء میں خیرالدین نے وفات پائی۔ جنازہ اُٹھا تو سارے جہاز سلامی کی توپیں داغ رہے تھے۔ مُدّت تک یہ دستور رہا کہ جب ترکی بیڑا باہر جاتا یا باہر سے واپس آتا تو خیرالدین کی قبر کے سامنے پہنچتے ہی سلامی کی توپیں سر کی جاتیں۔

۱۔ یہ وہی مقام ہے جسے عام لوگ مارسیلز کہتے ہیں۔ صحیح تلفظ مرسائی ہے جو عربی الاصل معلوم ہوتا ہے، مرسی یعنی بندرگاہ۔
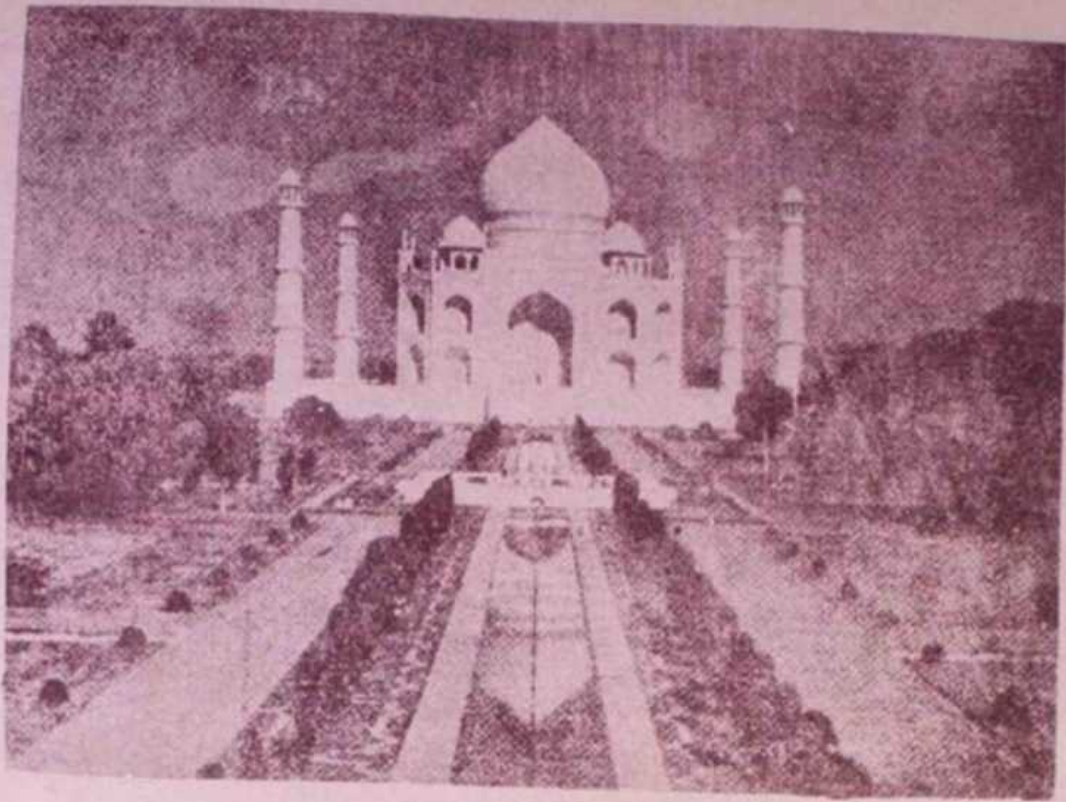
دُنیا کا یگانہ مقبرہ بنتا ہے

تاج محل شاہ جہاں کی چہیتی بیگم کا مقبرہ ہے، جس میں وہ بعدازاں خود بھی دفن ہُوا۔ آج رُوئے زمین پر جتنی بھی عمارتیں موجود ہیں، نقشے کی دل آویزی، تعمیر کی خُوبصورتی، نزاکت، گل کاری اور شان وشکوہ میں کوئی تاج کے مُقابلے پر نہیں آسکتی اور جب سے دُنیا آباد ہوئی ہے ایسا مقبرہ آج تک بنایا نہیں جاسکا۔ آگرے کی پُرانی عظمت کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ لیکن جب تک تاج موجُود ہے، آگرہ دُنیابھر کے سیاحوں کی زیارت گاہ بنا رہے گا۔

دیدہ وروں نے اس عمارت کی تعریف میں جو کُچھ کہا ہے اسے جمع کیا جائے تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ کسی نے کہا اس کے اُوپر کانچ کا سرپوش رکھ دینا چاہیئے۔ کسی نے کہا۔ یہ مقبرہ نہیں مرمریں خواب ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ چاندنی رات میں اس خالص موتی کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سنگِ مرمر پانی سے زیادہ رواں دواں ہے اور وہاں ایک دم کے لیے ٹھہر جانا ہمیشگی سے زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ یہ عمارت نہیں بلکہ جوانمرد کے عشق و محبّت نے اپنے راز کے چہرے سے پردہ اُٹھا دیا ہے اور پتھروں کو نوکِ مژگاں سے پرو کر پیوستہ کر دیا ہے۔

شاہ جہاں کی بیگم ممتاز محل نے دکن سے واپس ہوتے ہُوئے برہان پُور کے قریب انتقال کیا۔ بادشاہ کے لیے یہ سانحہ اس درجہ غم افزا ثابت ہُوا کہ ایک ہی سال میں بال سفید ہو گئے۔ اپنا غم غلط کرنے کے لیے مقبرے کی تعمیر شروع کر دی۔

اور سترہ سال کی محنت و مشقّت کے بعد یہ نادرِ روزگار عمارت نہایت اعلیٰ سنگِ مرمر سے تیار ہوئی۔

ایک نہایت خُوبصورت باغ کے وسط میں اُونچا چبوترہ ہے جس کے چاروں کونوں پر سنگِ مرمر کے چار مینار کھڑے ہیں۔ اس چبوترے کے عین بیچ میں مقبرے کی عمارت ہے جس نے ایک سو چھیاسی فٹ مربّع جگہ گھیر رکھی ہے۔ مقبرے کے اُوپر اسّی فٹ اُونچا مرمریں گنبد ہے جس کی چوٹی پر خالص سونے کا درخشاں کلس چمک رہا ہے۔ اس گنبد کے اردگرد چار چھوٹے گنبد ہیں۔

اندر اور باہر در و دیوار پر عقیق، یشب، لاجورد اور دُوسرے قیمتی پتھروں کے پھُول اور بیل بوٹے اس خوب صُورتی سے بنائے گئے ہیں کہ موجودہ زمانے کے کاریگر انجینیئر انھیں دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ پھُولوں کی پنکھڑیوں میں رنگ رنگ کے نگ جڑے ہُوئے ہیں اور ان کے جوڑ اس خوبی سے ملائے گئے ہیں کہ ناخن بھی پھیریں تو کہیں نہیں رُکتا۔ گویا پُورے مقبرے کا اندرون اور بیرون ایک سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے۔

محرابوں اور دیواروں پر قرآن مجید کی آیتیں نہایت خوبصورتی سے کھُدی ہوئی ہیں اور ان میں سنگِ مُوسیٰ کے حرُوف بھر دیئے گئے ہیں۔ عین بیچ کے ہال میں تعویذ کے اردگرد سنگِ مرمر کا جو جالی دار کٹہرا لگایا گیا ہے۔ دیکھیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ اسے انسانی ہاتھوں نے نہیں بنایا۔ اس کی باریک بیلیں، نازک سُرخ پھُول، نہایت خوش وضع سبز پتّیاں، سُنہری نقش و نگار۔ بس آدمی وہاں پہنچ کر حیرت کی تصویر بن جاتا ہے۔

ایسے مقبرے کا تصوّر بھی دماغ میں قائم کرلینا انسانی فکر و نظر کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ پھر اس تصوّر کو سنگِ مرمر کا لباس پہنا کر محبّت کا ایک جیتا جاگتا پیکر بنا کر کھڑا کر دینا یقیناً ہنرمندی کا ایسا کرشمہ تھا جو خدا نے صرف شاہ جہاں کو عطا کیا۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی کو یہ شرف نصیب نہ ہُوا۔

شاہ جہاں کا کارنامہ صرف تاج محل نہیں، اور بھی کئی عمارتیں ہیں جن کے لیے دُنیا بھر کے دیدہ ور تین صدیوں سے خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ مثلاً دہلی کا لال قلعہ، قلعہ آگرہ کی موتی مسجد، لاہور کا شالا مار باغ، کابل میں باغ بابر والی مسجد جو مہم بلخ میں کامیابی حاصل کرنے پر بطور یادگار بنائی گئی تھی اور یہ خالص سنگِ مرمر کی ایک نہایت خوبصورت عمارت ہے۔ ان تعمیرات کے علاوہ تختِ طاؤس کی یاد تازہ کرو۔ تاریخ گواہی دے رہی ہے کہ ویسا تخت آج تک دُنیا کے کسی بادشاہ کو نصیب نہ ہُوا۔ ذرا تصوّر کرو لال قلعے کے دیوانِ خاص میں یا دیوانِ عام کی شاہی نشست گاہ میں بادشاہ تختِ طاؤس پر جلوس فرماتا ہوگا تو دیکھنے والوں پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہوگی۔ تاہم ان میں سے کوئی بھی چیز تاج محل کے برابر عظمت و شہرت حاصل نہ کر سکی۔ یہ مقبرہ جب بنا تھا اس وقت بھی یگانہ تھا، آج بھی یگانہ ہے اور آیندہ بھی ایسا مقبرہ بننے کی کوئی اُمید نہیں۔

چیچک کا علاج دریافت ہوتا ہے

چیچک بہت پرانی بیماری ہے۔ تاریخوں میں بتایا گیا ہے کہ وبائی صورت میں اس کا آغاز ۵۴۳ء میں ہوا۔ ۵۶۹ء میں یہ وبا قسطنطنیہ پہنچی۔ اس سے کچھ مدت بعد یمن کے حبشی حاکم ابرہہ نے مکّہ شریف پر یورش کی تھی لیکن اس کا لشکر مکّہ شریف کے قریب ہی خدا کی قدرت سے تباہ ہو گیا اور اسے نامراد لوٹنا پڑا۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ ابرہہ کے لشکر میں بھی چیچک کی وبا نمودار ہو گئی تھی۔

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ دسویں صدی عیسوی میں یہ وبا مشرقِ ادنیٰ اور مشرقِ اوسط میں عام ہو چکی تھی اور طبیب اس کے علاج سے عاجز تھے۔ اس موقع پر اسلام کے مشہور طبیب حکیم ابوبکر محمّد بن زکریّا رازی نے چیچک کا کامیاب علاج تجویز کیا۔ اس مرض پر ایک مستقل کتاب لکھی جس میں مرض کے تمام پہلوؤں پر مفصّل بحث کی۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی تک مشرق میں حکیم محمد بن زکریا کے تجویز کیے ہوئے علاج سے بے شمار آدمی صحت یاب ہوتے رہے۔ حکیم موصوف کی یہ کتاب چھپ چکی ہے اور آج بھی انسانیت کے اس محسن کی عظمت کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔ طبّی دنیا میں وہ پہلا شخص ہے جس نے چیچک کا علمی علاج دریافت کیا اور اس کا اعتراف انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بھی کیا گیا ہے۔

اٹھارھویں صدی میں ایڈورڈ جینر نام ایک انگریز نے چیچک کا علاج دریافت کرنے کی طرف توجّہ کی۔ وہ ہر چھوٹے بڑے معاملے پر غور کرنے اور اس کی تہ تک پہنچنے کا عادی تھا۔ علاج کی دریافت کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔ گلاؤسٹر شائر کے لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ گئو تھن سیتلا چیچک کا تریاق ہے، اس لیے کہ جو لوگ گایوں کا دودھ دوہتے تھے، وہ عموماً چیچک کی بیماری سے بچے رہتے تھے۔ بس اس عقیدے کی بنا پر جینر چھان بین کرتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ گئو تھن سیتلا دو قسم کی ہوتی ہے اور ان میں سے صرف ایک قسم چیچک کو روکتی ہے۔

جینر نے ۱۷۹۶ء میں گئو تھن سیتلا سے مادہ لے کر اپنے بچّے کا ٹیکہ کیا اور دو مہینے بعد چیچک کا مادہ ٹیکے کے ذریعے سے بچّے کے جسم میں داخل کر دیا اور وہ بالکل تندرست رہا۔ بس اس تجربے کی بنا پر وہ ٹیکا ایجاد ہوا جو گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں کروڑوں آدمیوں کی جانیں چیچک جیسی موذی وبا سے بچا سکا ہے۔ جینر کا یہ احسان دنیا کبھی نہیں بھلا سکتی، لیکن اس سے آٹھ سو سال پیشتر جس طبیب نے چیچک کو روکنے کی تدبیریں مکمل کی تھیں، اس کی یاد بھی برابر تازہ رہنی چاہیے۔

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

دُنیا میں ایسے آدمی کم پیدا ہوتے ہیں جن کے سامنے کوئی بلند مقصد ہو اور وہ اس کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دینے میں بھی تامّل نہ کریں۔ ایسے ہی آدمیوں سے قوموں کی زندگی کے چراغ روشن رہتے ہیں اور ایسے ہی آدمیوں سے ملکوں کی تاریخیں بنتی ہیں۔ ٹیپو سلطان شہید اسی صف کے ایک ممتاز مجاہد تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "شیر کی زندگی کا ایک دن گیدڑ کی زندگی کے ایک سو سال سے بہتر ہے۔" یہ بالکل درست ہے۔ انسان کے لیے یہی زیبا ہے کہ شیر کی طرح زندگی بسر کرے۔ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے ہر خطرے کے سامنے چٹان کی طرح جم جائے۔ اپنا شکار آپ مارے اور اپنی ضرورتیں خود پوری کرے۔ گیدڑ کی زندگی کیا ہے؟ نہ کسی کے مقابلے کی ہمت، نہ کسی سے ٹکر لینے کا حوصلہ۔ پتّا بھی کھڑکے تو دل کانپ اُٹھے۔ ہوا کا جھونکا آئے تو رُوح لرز جائے۔ شیر شکار مار کر جو کچھ چھوڑ جاتے، اس سے پیٹ بھر لیتا ہے۔ ورنہ بھُوکا رہتا ہے۔

ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی نے جنوبی ہند میں بہت بڑی سلطنت قائم کر لی تھی، جس کا مرکز سرنگاپٹم تھا اور جو سلطنت میسور کے نام سے مشہور تھی۔ حیدر علی پہلا شخص تھا جس نے بھانپ لیا تھا کہ جو فرنگی، تاجروں کے بھیس میں ہندوستان آئے ہیں اور اُنھوں نے ملکی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا ہے، اگر انھیں قدم جما لینے کا پُورا موقع مل گیا تو پُورے ملک کے لیے ایک خوفناک خطرہ بن جائیں گے۔ حیدر علی نے فرنگیوں کے خطرے کو مٹا دینے میں

کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وہ لڑ رہا تھا۔ خدا کی طرف سے بُلاوا آگیا اور وہ اپنے جگر بند کے لیے دو ورثے چھوڑ کر رُخصت ہوگیا: ایک تاج و تخت اور دُوسرا فرنگیوں کے خطرے کا انسداد۔ ٹیپو سلطان نے دونوں ورثے جوانمردی سے سنبھالے: تاج و تخت کی حفاظت اور فرنگیوں کی شکست و ریخت میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا، یہاں تک کہ اپنی قیمتی جان بھی اس بازی میں لگا دی۔

فرنگیوں سے اسے دو زبردست لڑائیاں پیش آئیں۔ اگر اُنھیں مرہٹوں اور نظام کی امداد نہ ملتی تو سلطان یقیناً ان کے اقتدار کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیتا، لیکن دونوں مرتبہ مرہٹوں اور نظام نے نہ صرف سُلطان سے، بلکہ ملک کے بہترین مقاصد سے غداری کی۔ آخری لڑائی میں فرنگیوں، مرہٹوں اور نظام نے سُلطان کے مرکزِ حکومت کا محاصرہ کر لیا۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو اس شیر دل مجاہد نے میسور کی سلطنت اور ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑتے ہُوئے شہادت پائی۔ مرہٹوں اور نظام نے جن فرنگیوں کو مدد دے کر ٹیپو سُلطان کو شہید کرایا تھا، اُنھیں کے ہاتھوں وہ خود بھی برباد ہوئے اور قُدرت نے بدلے کا جو قانون مقرر کر رکھا ہے، وہ پُورا ہُوا۔

عزت کی زندگی کے دو ہی راستے ہیں: جواں مردوں کی طرح زندہ رہنا یا جواں مردوں کی طرح جان دے دینا۔ ٹیپو سُلطان نے اپنے اہلِ وطن کے سامنے ۱۷۹۹ء میں یہی نمونۂ عمل پیش کیا تھا۔ اس کی شہادت کے بعد فرنگی ہنستے کھیلتے پُورے ملک پر قابض ہو گئے، لیکن سلطان شہید نے آزادی کی جس آگ کا بندوبست کر دیا تھا، وہ برابر سُلگتی رہی۔ کبھی کبھی اس میں بھڑک بھی پیدا ہوتی۔ آخر کار اس نے اجنبیوں کے اقتدار کو جلا کر خاکستر بنا دیا۔ گویا سلطان نے جو خواب دیکھا تھا، وہ ڈیڑھ سو سال کے بعد پُورا ہُوا۔ آج نظام اور مرہٹوں کا کوئی نام بھی نہیں لیتا، لیکن ٹیپو سلطان نے خونِ شہادت سے عزت مندانہ زندگی کا جو نقش جما یا تھا وہ پُوری آب و تاب سے چمک رہا ہے اور جب تک دُنیا باقی ہے برابر چمکتا رہے گا۔

کشمیر گلاب سنگھ کے ہاتھ بکتا ہے

پنجاب میں سکھوں کی حکومت کا شیرازہ رنجیت سنگھ کی موت کے ساتھ ہی بکھرنے لگا تھا۔ پانچ چھ سال تک سکھ سردار باہم لڑتے اور ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارتے رہے۔ آخر ایسی حالت پیدا ہوگئی کہ سپاہ قابو میں نہ رہی ۱۸۴۵ء میں جو لوگ انتظام کے مختار بنے تھے اُنھوں نے سپاہ کی سرکشی سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک عجیب تدبیر سوچی، یعنی اُسے برانگیختہ کرکے انگریزی علاقے پر حملہ کرا دیا۔ اس طرح انگریزوں اور سکھوں کے درمیان پہلی جنگ چھڑی۔ تھوڑی ہی مدت میں سکھ شکست پر شکست کھا کر بدحال ہو گئے اور انگریزی سپاہ دریائے ستلج کو عبور کرکے سکھوں کے علاقے میں داخل ہوگئی۔

اب سب پر پریشانی طاری ہوگئی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لڑائی بند کرانے کی تدبیر کیا ہو سکتی ہے۔ جموں کے حاکم گلاب سنگھ ڈوگرہ نے لڑائی میں کوئی حصہ نہ لیا تھا اور خُفیہ خُفیہ اپنا تعلق انگریزوں سے قائم کر رکھا تھا۔ اُسے بلایا گیا کہ انگریزوں سے صُلح کی بات چیت کرے۔ آخر گلاب سنگھ کی کوشش سے فیصلہ ہوا کہ ستلج اور بیاس کا درمیانی علاقہ انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ کروڑ کی رقم بطور تاوان ادا کی جائے۔ خزانے میں اتنی رقم نہ تھی۔ سکھوں کی طرف سے جو لوگ مختار تھے، اُنھوں نے کہا کہ اڑسٹھ لاکھ روپے گلاب سنگھ کے ذمے واجب الادا ہیں، یہ اس سے لے لیے جائیں۔ باقی رقم قسطوں میں ادا کر دی جائے گی۔ انگریز گورنر جنرل نے جواب دیا کہ ہم دربار اور اس کے کارندوں کے پُرانے جھگڑوں میں دخل نہیں دینا چاہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ گورنر جنرل کے آدمیوں نے پہلے ہی سے خُفیہ خُفیہ گلاب سنگھ کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا۔ اس کے مطابق دربار سے کہا گیا کہ دریائے بیاس اور دریائے سندھ کے درمیان جتنا پہاڑی علاقہ ہے، وہ ایک کروڑ روپے کے معاوضے میں انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے۔ ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کو سکھوں سے عہد نامہ ہوا اور ستلج و بیاس کے درمیانی علاقے کے علاوہ وہ پہاڑی علاقہ بھی لے لیا گیا جس میں بالائی ہزارہ، کشمیر، جموں، چمبہ وغیرہ شامل تھے۔ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو گلاب سنگھ کے ساتھ جموں، کشمیر اور بالائی ہزارہ کا سودا ایک کروڑ پر کر لیا گیا۔ امرتسر میں اس عہد نامے پر دستخط ہوئے تو گلاب سنگھ نے گورنر جنرل کے رُوبرُو ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میں تو انگریزوں کا زرخرید غلام ہوں۔

لاکھوں بندگانِ خدا کو بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت
کر دینے کے اس واقعے کی مثال تاریخ میں نہیں
ملتی ۔ خود انصاف پسند انگریز بھی اقرار کرتے رہے
کہ یہ سودا انگریزوں کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔
لیکن اس سے بھی دردناک امر یہ ہے کہ گلاب
سنگھ کو اپنے پاس سے کوئی رقم نہ دینی پڑی، وہ
اس طرح کہ :

۱۔ سکھ دربار کا دعویٰ تھا کہ جموّں کے صوبیدار
کی حیثیت سے اڑسٹھ لاکھ روپے گلاب
سنگھ کے ذمّے تھے ۔ کم از کم اس میں شبہ
نہیں کہ جب سکھوں نے انگریزوں سے لڑائی
شروع کی اور گلاب سنگھ پر امداد کے لیے
زور ڈالا تو وہ اڑسٹھ لاکھ روپے پیش کرنے
پر آمادہ تھا۔

۲۔ ابتدا میں یہ طے ہوا تھا کہ دریائے راوی
اور دریائے سندھ کے درمیان کا پورا پہاڑی
علاقہ گلاب سنگھ کو دے دیا جائے جس میں
چمبہ بھی شامل تھا۔ پھر چمبہ اور اس کا علاقہ
الگ کر لیا گیا۔ علاقے میں یہ کمی کی گئی تو
تاوان کی رقم بھی ایک کروڑ سے گھٹا کر پچھتر
لاکھ کر دی گئی۔

۳۔ گلاب سنگھ کے بھائی سوچیت سنگھ نے اپنی
زندگی میں پندرہ لاکھ روپے کی رقم فیروزپور
میں دفن کرا رکھی تھی۔ وہ انگریزوں کے قبضے
میں تھی ۔ اُنھوں نے یہ پندرہ لاکھ روپے
بھی تاوان میں شامل کر لیے گویا گلاب سنگھ
کے اڑسٹھ لاکھ اور سوچیت سنگھ کے پندرہ
لاکھ روپے ملا کر تراسی لاکھ بن گئے اور صرف
اسے پچھتر لاکھ دینے پڑے ۔

کشمیر کی فروخت کا واقعہ مختلف حیثیتوں سے
بے حد اہم ہے ۔ اوّل بڑے بڑے علاقوں کی
فروخت کا ایسا کوئی واقعہ تاریخ میں نہیں ملتا۔
دُوسرے ان علاقوں کے باشندے ایک سو سال
تک گلاب سنگھ اور اس کے جانشینوں کے ماتحت
خوفناک ظلم و ستم کا نشانہ رہے ۔ تیسرے گُلاب
سنگھ ہی کے ایک جانشین نے پاک و ہند کی تقسیم
کے وقت کشمیر و جموّں کے بارے میں ایک ایسا
افسوسناک قدم اُٹھایا کہ اس پر خونریز لڑائی
شروع ہو گئی ۔ جو سوا سال جاری رہی ۔ پھر
لڑائی بند ہوئی اور اصل جھگڑا انجمن اقوام متّحدہ
میں پہنچا ، لیکن اس کے تصفیے کی کوئی منصفانہ صورت
اب تک سامنے نہیں آئی اور پاک و ہند کے درمیان
کشمکش کے اسباب میں جموّں اور کشمیر کو سب سے
بڑھ کر اہمیّت حاصل ہے۔

نقشہ نہر سویز

نہر سویز تیار ہوتی ہے

دُنیا کی ایسی کوئی آبی شاہراہ پیش نہیں کی جا سکتی جس نے مشرق و مغرب کی تجارت، سیاست اور میل جول پر اتنا گہرا اور وسیع اثر ڈالا ہو، جتنا کہ نہر سویز نے ڈالا۔ بحیرۂ رُوم کو آبی راستے سے بحیرۂ قلزم کے ساتھ ملانے کے منصوبے بہت پُرانے تھے اور ان پر عمل بھی ہوتا رہا۔ ابتدائی زمانے میں ایسی کوشش کا جو اندازہ کیا جا سکا ہے وہ یہ ہے کہ دریائے نیل کے کسی حصّے سے ایک نہر نکال کر بحیرۂ قلزم تک پُہنچا دی گئی تھی۔ بحیرہ روم سے کشتیاں دریا کے راستے اندر آتیں پھر نہر کے ذریعے سے بحیرۂ قلزم میں پہنچ جاتیں۔ ہارونُ الرّشید نے بھی ایک نہر کے ذریعے سے بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ روم کو ملانا چاہا تھا لیکن وہ اس وجہ سے رُک گیا کہ اس طرح موقع پاکر رومی بیڑا عرب کے ساحل تک پہنچ جائے گا اور وہ پاک سرزمین خطرے میں پڑ جائے گی جسے بچائے رکھنا ہر مُسلمان کے ایمان کا جزو ہے۔ جب پرتگیزوں نے راس اُمیّد کا چکّر کاٹ کر ہندوستان اور مشرق بعید کا راستہ معلوم کر لیا اور اس سے وینس کی بحری تجارت پر زد پڑی تو وینس کے انجینئروں نے بحیرۂ رُوم سے بحیرۂ قلزم تک ایک نہر نکالنے کی تجویز پیش کی تھی، لیکن سلطنت عثمانیہ نے اُسے منظور نہ کیا۔

انیسویں صدی کے وسط میں ایک فرانسیسی انجینئر ڈی لیسپس نے نہر کی اسکیم تیار کی۔ رسعید

پاشا خدیو مصر سے لیسپس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ اس نے نہر کے لیے ایک کمپنی بنانے کی تجویز منظور کرالی جس کا سرمایہ بیس کروڑ فرانک رکھا گیا اور اسے پانسو فرانک کے چار لاکھ حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جب لیسپس اس کمپنی کی منظوری حاصل کرنے کے لیے قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) پہنچا تو وہاں برطانوی سفیر نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اُسے اندیشہ تھا کہ اس نہر کے بن جانے سے برطانیہ کی بحری برتری کو نقصان پہنچے گا اور فرانسیسیوں کے لیے مشرق میں مداخلت کا دروازہ کھُل جائے گا، تاہم کمپنی کا کام جاری رہا۔ ۲۵ر اپریل ۱۸۵۹ء کو پورٹ سعید کی طرف سے اس کی کھُدائی شروع ہوئی۔ دس سال میں نہر مکمل ہوگئی۔ ۱۶ر نومبر ۱۸۶۹ء کو نہر کا افتتاح ہوا۔ اس کے بڑے حصّے دار تین تھے۔ فرانس، ترکی اور خدیو مصر۔ اسماعیل پاشا خدیو مصر کو مالی مشکلات پیش آئیں تو اس کے ایک لاکھ چھہتر ہزار چھ سو دو حصّے حکومت برطانیہ نے پونے چالیس لاکھ پونڈ کی رقم دے کر ۱۸۷۵ء میں خرید لیے۔ ۳۱ر مارچ ۱۹۴۸ء کو ان حصّوں کی قیمت دو کروڑ پینتالیس لاکھ بانوے ہزار تین سو دس پونڈ تھی۔

نہر کے انتظام کے لیے کئی مرتبہ بین الاقوامی نمایندوں کے اجتماع ہوئے جن میں ۱۸۸۸ء کا اجتماع خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس میں فیصلہ ہوگیا تھا کہ نہر تمام قوموں کے جہازوں کے لیے کھُلی رہے گی۔ ۲۹ر نومبر کو اس سمجھوتے پر مختلف حکومتوں نے دستخط کر دیے جن میں سے برطانیہ، فرانس، رُوس، ترکی اور اٹلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نہر کی تعمیر اور توسیع پر کل اٹھاسی کروڑ اکتالیس لاکھ چھیانوے ہزار فرانک خرچ ہُوئے۔ یہ ایک سو ایک میل لمبی ہے اور چوڑائی ایک سو چھیانوے فٹ دس انچ سے کم نہیں۔ اس میں سے جہاز کے گزرنے کا عام وقت گیارہ گھنٹے اور اکتیس منٹ رکھا گیا ہے۔ اس نہر نے یورپ اور جنوبی و مغربی ایشیا کو ایک دُوسرے کے بہت قریب کر دیا ہے۔ راس اُمید کے راستے بہت چکر پڑتا تھا۔

جب برطانوی فوج نہر سویز کے حلقے سے نکل گئی اور حکومت مصر کو اسوان بند کی تعمیر کے لیے برطانیہ اور امریکہ نے مناسب مالی امداد دینے سے انکار کر دیا تو حکومت مصر نے نہر سویز کو قومی بنا لینے کا اعلان کر دیا اور سارا انتظام خود سنبھال لیا۔ اس پر کشمکش شروع ہوئی۔ جس نے نومبر ۱۹۵۶ء میں جنگ کی صُورت اختیار کر لی۔ انجمن اقوام متحدہ کے بیچ بچاؤ سے جنگ بند ہوئی۔ برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے اپنی فوجیں ہٹالیں اور اب مصر کے قومی حقوق کو محفوظ رکھتے ہُوئے ایسے سمجھوتے کی کوششیں ہو رہی ہیں جو سب کے لیے باعث اطمینان ہو۔

دولتِ سعودیہ کی بُنیاد پڑتی ہے

دولتِ سعودیہ کا بانی عبدالعزیز گیارہ سال کا تھا جب اس کے والد عبدالرحمٰن نے امیر حائل کے مقابلے میں آخری مرتبہ شکست کھائی۔ آبائی سلطنت چھن گئی۔ بال بچوں کو ساتھ لے کر ریاض سے نکلنا پڑا، جو ساٹھ سال سے خاندان سعودیہ کی امارت کا مرکز چلا آتا تھا۔ چھنی ہوئی متاع کے دوبارہ حاصل ہونے کی بظاہر کوئی اُمید نہ تھی، بلکہ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ جلاوطنی کے دن کیونکر گزریں گے۔

یہ لوگ کویت میں مقیم ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں عبدالعزیز کی عمر اکیس سال کی ہوئی تو اس نے حصولِ امارت کے لیے ایک منصوبہ اپنے دل میں تیار کیا اور خاص رفیقوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ صحرائی علاقے میں نکل گیا، جہاں سر پہ آسمان کے سوا کوئی شامیانہ اور پاؤں کے نیچے ریت کے سوا کوئی فرش نہ تھا۔ مہینے گزر گئے اور والدین کو اس کے بارے میں کوئی خبر نہ ملی۔ رمضان (دسمبر ۱۹۰۱ء) کا مہینہ آ گیا جس میں اس نے منصوبے پر عمل کی تیاری مکمل کر لی۔ اس اثنا میں والد کی طرف سے پیغام پہنچا کہ واپس آ جاؤ۔ عبدالعزیز نے قاصد کو جواب دیا کہ واپس جاؤ اور والد کی خدمت میں عرض کرو کہ میں نے جان کی بازی لگا دی ہے۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ ہمارا ملک غیروں کے قبضے میں رہے اور ہمارا خاندان جلاوطنی کی ٹھوکریں کھائے۔ میرے لیے دو ہی راستے ہیں، کامیابی یا موت، تیسرا کوئی نہیں۔ فتح و شکست خدا کے ہاتھ میں ہے۔

عید الفطر کی نماز کے بعد وہ چھپتا چھپاتا ریاض کی جانب روانہ ہوا۔ جب شہر چھ سات میل رہ گیا تو اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک گروہ کو وہاں ٹھہرا دیا۔ سواریاں اس کے حوالے کیں اور کہہ دیا کہ اگر چوبیس گھنٹے تک ہماری طرف سے کوئی خبر نہ ملے تو کویت چلے جانا اور میرے والد سے کہہ دینا کہ میں مارا گیا یا قید ہو گیا۔

آگے کھجوروں کے گھنے باغ تھے۔ تھوڑا سا فاصلہ اور طے کیا تو صرف دس آدمی چُن لیے۔ باقی ساتھیوں سے کہا کہ یہاں انتظار کرو۔ صبح تک ہماری طرف سے کوئی پیغام نہ آئے تو سمجھ لینا کہ ہم اپنا فرض ادا کرتے ہوئے مارے گئے اور تم واپس چلے جانا۔

ذرا اندھیرا ہو گیا تو دس ساتھیوں کو لے کر شہر کے اندر پہنچا جس کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ایک مکان کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہوا تو گھر والوں نے پہچان لیا اور کہا "خدا کے لیے واپس چلے جائیے آپ کیوں جان خطرے میں ڈال کر یہاں آ گئے ہیں؟" عبدالعزیز نے جواب دیا کہ میں جو ارادہ کر کے آیا ہوں، اسے ضرور پُورا کروں گا۔ اب واپسی کا سوال بے محل ہے۔ چُپ رہو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔

اس نے معلوم کر لیا کہ امیر حائل کی طرف سے جو حاکم مقرر ہے وہ رات قلعے میں گزارتا ہے اور صبح کے وقت اپنے مکان میں آتا ہے، جو قلعے کے عین سامنے تھا اور جس مکان میں عبدالعزیز پہنچا تھا اس سے زیادہ دُور نہ تھا۔ وہ چھت پر سے ہوتا ہوا حاکم کے مکان میں پہنچا۔ عورتوں، نوکروں چاکروں کو ایک کوٹھڑی میں بند کیا۔ رات بھر یہ دس جوانمرد نفل ادا کرتے، دُعائیں مانگتے اور قرآن پڑھتے رہے۔ صبح کی نماز کے بعد مکان کی اس شہ نشین میں بیٹھ گئے، جس کے سامنے لکڑی کی جالی لگی ہوئی تھی اور قلعے کا دروازہ صاف نظر آتا تھا۔

پَو پھٹی، دروازہ کھلا، حاکم باہر نکلا اور سامنے جو سپاہی کھڑے تھے، ان سے باتوں میں لگ گیا۔ یکایک یہ دس آدمی اُٹھے اور انتہائی تیزی سے حاکم پر جا گرے۔ عبدالعزیز سب سے آگے تھا۔ چند منٹ تک سب لوگ ہکا بکا کھڑے رہے۔ حاکم نے بھاگ کر قلعے میں گھسنا چاہا اور ہر طرف سے ان دس جانبازوں پہ گولیوں کی بارش شروع ہو گئی، لیکن خطرے کے بھنور میں پہنچ کر کسے خیال ہو سکتا تھا کہ کون جیتا اور کون مرتا ہے۔ حاکم مارا گیا۔ عبدالعزیز نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ شہر میں منادی کرا دی گئی کہ خاندان سعُود نے اپنی ملکیت سنبھال لی ہے۔ سب لوگ مبارک باد کے لیے آنے لگے۔ بے مثال بہادری کے اس کارنامے نے ان عربوں کو حیرت میں ڈال دیا، جن کے لیے جانبازی ہمیشہ بچوں کا کھیل رہی۔ نجد کا بچہ بچہ عبدالعزیز پہ جان چھڑکنے کو سب سے بڑا فخر سمجھنے لگا۔

ریاض ۱۳ جنوری ۱۹۰۲ء کو فتح ہوا تھا۔ پھر عبدالعزیز کو آبائی حکومت واپس لینے میں جو جانفشانیاں کرنی پڑیں، وہ تاریخ عرب کا سنہری باب ہیں۔ علاقوں پر علاقے فتح ہوتے گئے، یہاں تک کہ دولت سعودیہ کے نام سے عرب میں وہ سلطنت قائم ہو گئی جس سے بڑی سلطنت سات سو سال سے دیکھی نہیں گئی۔ یوں فتح ریاض تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ بن گیا۔
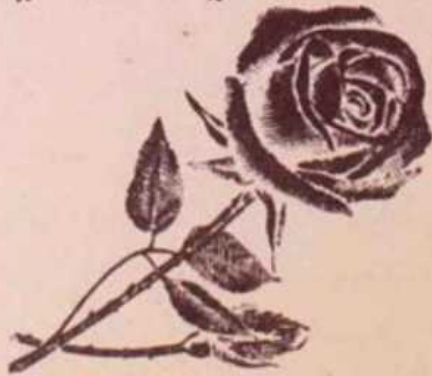
PHOTO FROM BETTMANN ARCHIVE

ڈائنامیٹ سے علم دان فائدہ اُٹھاتے ہیں

دُنیا میں ایسے آدمی بہت کم ملیں گے کہ ان کی ایجادات سے انسانوں کے لیے موت و ہلاکت کے سامانوں میں اضافہ ہوا، لیکن جب وہ مرے تو اپنی زندگی کا پُورا سرمایہ بڑے ہی نیک کاموں میں لگا گئے۔ انھیں میں سے سویڈن کا ایک شخص ایلفرڈ برن ہارڈ نوبیل بھی تھا، جس نے اپنے انعامات کی وجہ سے عالمگیر شہرت پائی۔

نوبیل ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کو آبدوز سرنگوں اور دھک سے اُڑ جانے والے مادّوں کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی۔ ساری عمر انھی کی تحقیقات میں گزار دی۔ نوبیل کا بھائی بھی مشہور انجینئر اور سائنس دان تھا۔ خود نوبیل کا جسم پیدائشی کمزور تھا۔ عمر بھر بیمار رہی سارہا، خصوصاً سر کے درد سے تو اسے کبھی نجات نہ ملی۔ ماں کو اس سے بڑی محبت تھی۔ اسے یقین تھا کہ میرا یہ بیٹا بہت بڑا آدمی بنے گا۔ جب نوبیل بیمار ہو کر پلنگ پر پڑ جاتا تو ماں پاس بیٹھ کر اسے کتابیں سُناتی رہتی۔ ہوش سنبھالا تو اسے بھی باپ کی طرح آتش گیر مادوں کی تحقیقات کا شوق پیدا ہو گیا۔ انجینئری سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ وہ امریکہ چلا گیا۔ وہاں سُنا کہ ایک شخص نے ایسا انجن ایجاد کیا ہے جو سُورج کی گرمی سے چلتا ہے اور اسے ایک کشتی میں لگایا جائے گا۔ نوبیل بھی اس شخص کا ساتھی بن گیا۔ کشتی تجربے کے لیے دریا میں ڈالی گئی تو اچانک ایسا طوفان آیا کہ وہ غرق ہو گئی۔ بس ساتھ ہی انجن کے موجد اور نوبیل کی امیدیں بھی ڈُوب گئیں۔

اس کے بعد نوبیل نے زندگی کے دو نصب العین مقرّر کر لیے۔ اوّل یہ کہ آتش گیر مادوں کی ایجاد سے دَولت کمائے، دُوسرے اس دولت کو ایسے کاموں میں لگا دے کہ سائنس دانوں کو نئے نئے تجربات میں مدد مل سکے۔ اَیسا نہ ہو کہ مالی تنگی کے باعث وہ اپنے خداداد جوہروں سے کام نہ لے سکیں۔

چنانچہ اس نے کئی ایجادیں کیں، جن میں سب سے زیادہ شہرت ڈائنامیٹ نے حاصل کی۔ اس نے ڈائنامیٹ کو رجسٹرڈ کرا کے جگہ جگہ کارخانے قائم کیے اور بڑا سرمایہ پیدا کر لیا۔ اگرچہ بیماری اس کا پیچھا نہ چھوڑتی تھی، تاہم وہ اس حالت میں بھی نئے نئے تجربے کرتا رہا۔ اکثر دیکھا گیا کہ سر سے پٹی بندھی ہوئی ہے اور وہ برابر سرگرمی سے اپنا کام کر رہا ہے۔

۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء کو وفات پائی۔ اس نے وصیت کر دی تھی کہ میری جائداد فروخت کر کے پورا سرمایہ بنک میں جمع کر دیا جائے اور اس کے منافع سے ہر سال پانچ انعام ان لوگوں کو دیے جائیں جو طبیعیات، کیمسٹری، طبابت، ادب اور امن عالم کے لیے بہترین خدمات انجام دیں۔ ۱۹۰۱ سے انعامات کا سلسلہ شروع ہوا اور اب تک بدستور جاری ہے۔

انعامات کی مقدار میں منافع کی رقم کے مطابق تھوڑی سی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ عام اندازہ یہ ہے کہ کوئی انعام پاکستانی سکّے کے مطابق ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہوتا۔ مذکورہ بالا پانچ شعبوں میں بہترین کام کرنے والوں کو ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ کی رقم مل جائے تو وہ اطمینان سے اپنا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔ کوئی سائنس دان اور موجد ایسا نہیں گزرا جس نے علم و امن کے لیے کام کرنے والوں کی امداد اور حوصلہ افزائی کا ایسا شاندار انتظام کیا ہو، جیسا نوبیل نے کر دیا ہے۔ انعامات کا یہ سلسلہ بیسویں صدی کی ابتدا سے جاری ہے اور جب تک نوبیل کا سرمایہ باقی ہے، یہ سلسلہ بدستور جاری رہے گا۔

غور کیجیے کہ ساٹھ سال ہونے کو آئے ہیں۔ ہر سال کم و بیش ساڑھے سات لاکھ کی رقم نوبیل کے جمع کرائے ہوئے سرمائے سے مل رہی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ بعض شعبوں میں کوئی قابل آدمی نہ مل سکا جو اپنی شاندار خدمات کی بنا پر انعام کا مستحق قرار پاتا۔ دوسری جنگ عظیم میں تین سال تک (۱۹۴۰ - ۱۹۴۲ء) انعامات ملتوی رہے۔

اس سلسلے میں فلپینز کا واقعہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہاں کی جمہوریت کے ہردلعزیز صدر "میگا سائی سائی" نے ہوائی جہاز کے حادثے میں وفات پائی۔ قوم نے اس کی یادگار کے لیے بہت بڑی رقم جمع کی اور نوبیل کی طرح یہ رقم بھی انعامات کے لیے وقف کر دی۔ چنانچہ مختلف شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دینے والے ایشیائیوں میں ہر سال انعام تقسیم کیے جاتے ہیں۔

PHOTO FROM EUROPEAN

جنگی مُجرموں پر مُقدّمہ چلتا ہے

جنگ کو کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا۔ مختلف قومیں اپنی نادانی سے اسے باہمی اُلجھنوں کے حل کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھتی رہیں۔ لیکن جب جنگ ختم ہوتی تو یہی نظر آیا کہ ایک اُلجھن کی جگہ دس نئی اُلجھنیں پیدا ہوگئیں اور حالات نے پہلے سے زیادہ نازک صُورت اختیار کر لی۔ اگر کسی وقت جنگ کے سوا چارہ نہ رہے تو فریقین میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ اس کا دائرہ زیادہ سے زیادہ تنگ رکھیں۔ غیر مصافی آبادی کو کوئی نقصان نہ پہنچے، ان کے گھر بار تباہ نہ ہوں، کاروبار پر زد نہ پڑے، لیکن ہٹلر نے ۱۹۳۹ء میں جو جنگ شروع کی، اس نے ابتدا ہی سے نہایت خوفناک شکل اختیار کر لی۔ اس میں کسی بھی فرد کی کوئی چیز محفوظ نہ تھی۔ جس جس مقام سے جرمن فوجیں گزریں، ایک قیامت سی برپا ہوگئی، بلکہ مفتوحہ علاقوں کے مختلف لوگوں پر ایسی سختیاں کی گئیں جن کا ذکر سُن کر ہی دِل کانپ اُٹھتا ہے، اسی لیے اتحادی ملکوں کے نمائندوں نے ۱۳ر جنوری ۱۹۴۲ء کو اعلان کر دیا تھا کہ جو لوگ تحقیقات کے بعد جنگ کے سلسلے میں مختلف جرموں کے ذمّہ دار پائے جائیں گے اُنھیں قانون کے مطابق سزائیں دی جائیں گی۔

۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۳ء کو جنگی جرائم کے لیے ایک کمیشن مقرر کر دیا گیا۔ جب ہٹلر نے خودکشی کر لی اور جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے تو بعض بڑے بڑے جنگی لیڈر مر چکے تھے، جو باقی تھے انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اُن کے تمام کاموں کی خوب چھان بین کی گئی۔ جب پُوری شہادتیں دستیاب ہوگئیں تو چار ججوں کی ایک عدالت مقرر کر کے جرمنی کے مشہور مقام نیورمبرگ میں ان پر مقدّمہ چلایا گیا۔ ۲۱ر نومبر ۱۹۴۵ء سے مقدمہ شروع ہوا۔ عدالت کے اجلاس آٹھ مہینے جاری رہے۔ اس اثنا میں دو سو گواہ

پیش ہوئے اور انھوں نے جو گواہیاں دیں وہ پچاس لاکھ الفاظ سے کم نہ ہوں گی۔

۲۹ر جون ۱۹۴۶ء کو عدالتی تحقیقات ختم ہوگئیں۔ پھر ججوں نے تمام دستاویزوں اور گواہیوں کے انبار سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جو یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء کو سُنایا گیا۔ چار جُرم قائم کیے گئے تھے، یعنی نازی سازش، جارحانہ اقدامات، جنگی جرائم، انسانیت سوز افعال۔ بارہ ملزموں کے لیے پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ ان میں گوئرنگ، ربن ٹروپ، کائیٹل وغیرہ جیسے بڑے بڑے لیڈر شامل تھے۔ بعض کو عمر قید یا بیس بیس سال، پندرہ پندرہ سال، دس دس سال قید کی سزا سنائی گئی اور صرف تین کو رہا کیا گیا۔ اول الذکر گروہ کو بتاریخ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۴۶ء پھانسی دے دی گئی۔ گوئرنگ نے پھانسی پانے سے پیشتر خودکشی کر لی تھی۔ ایک نازی لیڈر جس کا نام رابرٹ لی تھا، پہلے ہی خودکشی کر چکا تھا۔

اسی طرح جاپان کے جنگی مجرموں پر بھی مقدّمے چلائے گئے، جن میں سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر شخص توجو تھا، جو جنگ کے زمانے میں جاپان کا وزیرِ اعظم تھا۔

اِن سزاؤں کا اصل مقصد یہ تھا کہ جو لوگ آیندہ جنگ کے خواہاں ہوں اُنھیں کان ہو جائیں۔ وہ سمجھ لیں کہ عہد ناموں کے خلاف کسی کو موت و ہلاکت کا تختۂ مشق نہ بنانا چاہیے اور غیر مصافی آبادی کو اندھا دھند تباہ کرنے کے درپے نہ ہونا چاہیے۔ جو لوگ ایسا کریں گے، بین الاقوامی عدالت کے رُوبرُو مجرم ٹھہرائے جائیں گے اور انھیں سخت سے سخت سزائیں ملیں گی۔ گویا یہ سزائیں بھی جنگ یا اس کی ہولناکیوں کو روکنے کے لیے ضروری سمجھی گئیں۔ جنگی مجرموں کے خلاف باقاعدہ مقدّمہ چلا کر انھیں سزائیں دلانے کا یہ پہلا واقعہ ہے، اس لیے نیورمبرگ سے بین الاقوامی ضابطوں میں ایک نئے ضابطے کا اضافہ ہُوا۔

جنوبی ایشیا میں ترقی کی سکیمیں جاری ہوتی ہیں

دُوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایشیا کے جن ملکوں کو آزادی ملی، انھیں کئی مشکل مسئلے درپیش تھے، مثلاً محکومی کے زمانے میں ان کے قدرتی وسائل سے پُورا فائدہ نہ اُٹھایا گیا تھا اور وہ موجودہ زمانے کی ترقیات میں بہت پس ماندہ تھے۔ اس وجہ سے وہاں کے باشندوں کا معیارِ معیشت خاصا پست تھا۔ ۱۹۵۰ء کے شروع میں دولتِ مشترکہ کے وزرائے خارجہ کی ایک کانفرنس کولمبو میں ہوئی، جس میں دوسرے مسائل کے علاوہ اس مسئلے پر بھی غور کیا گیا۔ سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہُوا کہ جنوبی اور جنوبی و مشرقی ایشیا کا بنیادی مسئلہ اقتصادی ہے۔ اس لیے پہلا اور حددرجہ ضروری کام یہ ہے کہ ان علاقوں کے باشندوں کا معیارِ معیشت بڑھانے کی خاص کوشش کی جائے۔ پھر سڈنی (آسٹریلیا) کے اجلاس میں طے ہُوا کہ جنوبی اور جنوبی و مشرقی ایشیا کے تمام ملکوں سے ترقی کے منصوبے تیار کرائے جائیں جو چھ سال (۱۹۵۱ – ۱۹۵۷ء) پر پھیلے ہوئے ہوں، اس طرح انھیں ایک خاص ترتیب سے پُورا کیا جا سکے۔ اسی لاکھ پونڈ کی رقم فنّی امداد کے لیے منظور کر لی گئی۔

نقشے تیار ہو گئے تو وہی امدادِ باہمی کے اس وسیع منصوبے کی بُنیاد بن گئے جو کولمبو پلان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس منصوبے پر یکم جولائی ۱۹۵۱ء سے عمل شروع ہو گیا۔ چھ سال میں پُورے خرچ کا اندازہ ایک ارب چھیاسی کروڑ اسی لاکھ پونڈ کیا گیا تھا۔ اس میں ایک ارب تین کروڑ پونڈ کی رقم (۵۵ فیصد) "کولمبو پلان" کے ملکوں کو خود فراہم کرنی تھی۔ باقی تراسی کروڑ اسی لاکھ (۴۵ فی صد) کی رقم باہر سے قرض لے کر صرف کرنی تھی۔

دولتِ مشترکہ کی ایک مشاورتی کمیٹی بن گئی تھی جس کے ابتدائی رُکن پاکستان، ہندوستان، سیلون، کینیڈا،

آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، برطانیہ، ملایا، سنگاپور، سراوک، شمالی بورنیو اور برونی تھے۔ ویت نام، کمبودیا، لاؤس، ۱۹۵۰ء میں، برما اور نیپال ۱۹۵۲ء میں اور انڈونیشیا ۱۹۵۳ء میں ممبر بن گئے۔ گویا اقتصادی ترقی کے لیے تعاون کا یہ عظیم الشان منصوبہ پورے جنوبی و مشرقی ایشیا پر حاوی ہوگیا۔

پوری رقم میں سے ۳ ۷ فیصد حصہ ہندوستان کا تھا، پندرہ فی صد پاکستان کا اور ۱۲ فی صد باقی ملکوں کا۔ اسی طرح ترقی کے مختلف منصوبوں کے لیے بھی تناسب مقرر کردیا گیا تھا۔ مثلاً بتیس فی صد زراعت کے لیے، تینتیس فی صد وسائلِ حمل و نقل کے لیے، سات فیصد بجلی وغیرہ کے لیے، گیارہ فیصد صنعت و حرفت اور معدنیات کے لیے، سترہ فیصد مجلسی ترقی کے منصوبوں کے لیے۔

پاکستان نے ترقی کے منصوبوں کا جو نقشہ مشاورتی کمیٹی کے روبرو پیش کیا تھا اس کے خرچ کا اندازہ اٹھائیس کروڑ پونڈ یا دو ارب ساٹھ کروڑ روپے تھا۔ زراعت کو اس لیے خاص اہمیت دی گئی کہ جنوبی و مشرقی ایشیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ہمارے ملک کی بھی اسی فیصد آبادی زراعت پیشہ ہے۔ مدعا یہ تھا کہ آبیاری کے لیے نئے منصوبے مکمل کیے جائیں۔ زمین کو سیم سے بچایا جائے۔ بہتر بیج مہیا کیے جائیں اور جہاں جہاں ممکن ہو مشینری سے کھیتی باڑی کرائی جائے۔ ۱۹۵۱ء میں اندازہ کیا گیا تھا کہ ترقی زراعت کے منصوبے مکمل ہوجائیں گے تو ملک کی پیداوار میں تقریباً اکتیس فی صد کا اضافہ ہوجائے گا۔

غرض کولمبو پلان دو وجہ سے دورِ حاضر کا نہایت اہم واقعہ ہے: اوّل ترقی کے ایسے منصوبے جنوبی و مشرقی ایشیا کے ملکوں نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ دوسرے اتنے ملکوں نے مل جل کر ایسے منصوبوں کو پورا کرنے کا ذمہ کبھی نہ اٹھایا تھا۔ یہ منصوبہ مذکورہ بالا ملکوں کے درمیان دوستی اور ہمدردی کے مضبوط رشتے پیدا کرنے کا بھی موجب بن گیا۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہیئے کہ جو ملک مالی اور فنّی نقطۂ نگاہ سے پس ماندہ ہیں، وہ اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتے جب تک انھیں دونوں قسم کی امداد نہ ملے گی، یعنی ایسے آدمیوں کی خدمات بھی حاصل ہونی چاہئیں جو ماہرینِ فن ہوں اور جس حد تک ممکن ہو، ابتدا میں مالی امداد کا بھی بندوبست ہونا چاہیئے۔ پس ماندہ ملک ابتدائی مرحلوں سے گزر جائیں گے تو پھر انھیں زیادہ امداد کی ضرورت نہ رہے گی۔ وہ اپنی ہمت اور کوشش سے قدم آگے بڑھانے کے قابل ہوجائیں گے۔

سوڈان کو خود مختاری ملتی ہے

نقشہ سوڈان

یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو سوڈان کی آزادی کا اعلان ہؤا۔ مرکزی حکومت کی سرکاری عمارتوں سے مصری اور برطانوی جھنڈے اُتر گئے اور ان کی جگہ قومی پرچم اُڑنے لگا۔ اگر پہلے دَور کو نظر انداز کر دیا جائے، جس پر ستر بہتر برس گزر چکے ہیں، تو بے تکلّف کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر تھوڑی مدّت میں اور جتنی آسانی کے ساتھ سوڈان نے آزادی حاصل کی ہے، اس طرح شاید ہی کسی ملک کو آزادی ملی ہو۔

سوڈان میں آزادی کی پہلی تحریک سید محمد احمد نے جاری کی تھی جو عام طور پر "مہدی سوڈانی" کے لقب سے مشہور ہیں اور بہت بڑے عالم دین اور نہایت عابد و زاہد بزرگ تھے۔ سوڈان اس زمانے میں مصر کے ماتحت تھا۔ نظامِ حکومت بھی اچھّا نہ تھا اور جو حاکم مصر سے مقرّر ہو کر آتے تھے، وہ بھی اچھے نہ ہوتے تھے۔ اس وجہ سے سوڈانی سخت تکلیفوں میں مبتلا ہو گئے۔ سیّد محمد احمد نے ۱۸۸۱ء میں آزادی کے لیے پہلا قدم اُٹھایا اور تھوڑی ہی مدّت میں پُورا سوڈان مصریوں سے آزاد کرا لیا۔ انھوں نے سوڈانیوں کے مذہبی اور قبائلی امتیازات ختم کر کے ان میں یک جہتی کی رُوح پیدا کر دی۔ وہ مصر میں بھی اسی قسم کی اصلاحی تحریک جاری کرنا چاہتے تھے، لیکن ۱۸۸۵ء میں ان کی ناگہانی وفات نے تمام خوشگوار امیدیں ختم کر دیں۔ ان کے تمام رفیق درویش کہلاتے تھے اور ان کی حکومت درویشوں کی حکومت مشہور تھی۔

خلیفہ عبداللہ جانشین ہوئے، لیکن وہ سیّد محمد احمد کا قائم کیا ہؤا معیار برقرار نہ رکھ سکے۔

۱۸۹۸ء میں انگریزوں اور مصریوں نے سوڈان کو دوبارہ فتح کر لیا۔ پھر چالیس پینتالیس سال تک اس طرح سکوت چھایا رہا گویا آزادی کی رُوح گہری نیند سو گئی ہو۔

۱۹۴۲ء میں نئے تعلیم یافتہ گروہ کے اندر

حرکت پیدا ہوئی۔ بعدازاں دو سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں۔ ایک کے لیڈر سیّد محمد احمد مرحوم کے فرزند سیّد عبدالرحمٰن المہدی تھے۔ یہ جماعت حکومت سے تعاون کی حامی تھی اور مصر سے کوئی تعلق نہ رکھنا چاہتی تھی۔ دوسری جماعت مصر کے ساتھ رشتہ قائم رکھنا چاہتی تھی اور اس کے لیڈر سید علی المرغانی تھے۔

انگریزوں نے عوام کو مطمئن رکھنے کے لیے پہلے ایک مشاورتی کونسل بنائی اور اس کی شاخیں صوبوں میں بھی قائم کر دیں۔ اس طرح کام نہ چلا تو آرڈیننس کے ذریعے سے ایک قانون ساز مجلس اور ایگزیکٹو کونسل کا انتظام کر دیا۔ قانون ساز مجلس کے لیے انتخابات ہُوئے تو سید عبدالرحمٰن المہدی کی جماعت زیادہ نشستیں لے گئی۔

اب ایک عجیب دَور شروع ہوا۔ انگریز خود مختاری کے حامی تھے اور مصر سے تعلق کو پسند نہ کرتے تھے۔ مصر کے ساتھ گفتگو شروع ہوتی اور آزادی کا معاملہ سامنے آتا تو گفتگو ختم ہو جاتی۔ گویا مصر کی اس روش نے انگریزوں کو اپنی خواہش پُوری کر لینے کا موقع دے دیا۔ ممکن ہے انھیں خیال ہو کہ سوڈان مصر سے الگ رہے گا تو انگریزی اقتدار زیادہ دیر تک باقی رکھا جا سکے گا۔ ۱۹۵۱ء میں مصر نے ۱۹۳۶ء کے معاہدے اور مشترکہ حکومت کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ انگریزی حکومت نے یک طرفہ تنسیخ کو ناجائز قرار دیا، لیکن اس طرح سوڈان کے لیے جُداگانہ کارروائی کی کھُلی گنجائش پیدا ہوگئی۔ اسی سال سوڈان کی اسمبلی نے دستور میں ترمیم کے لیے ایک کمیشن بنا دیا۔ اس کمیشن نے بہت سا کام مکمل کر لیا، البتہ سیادت کے مسئلے پر اختلافات پیدا ہو گئے۔

تجویز کردہ دستور کا خلاصہ یہ تھا کہ سوڈان کو آزادی حاصل ہوگی۔ پارلیمنٹ کے دو ایوان ہوں گے، ایک کا نام سینٹ اور دُوسرے کا نام ایوانِ نمائندگان رکھا گیا۔ سینٹ کے ممبر تیس اور ایوانِ نمائندگان کے ممبر پچانوے منتخب ہُوئے۔ ۱۹۵۲ء میں شاہ فاروق معزول ہوگیا اور جنرل نجیب برسرکار آیا، جسے سوڈان میں غیر معمولی ہردلعزیزی حاصل تھی۔ اس پر ان سوڈانیوں کے حوصلے بڑھ گئے جو مصر سے تعلق قائم رکھنے کے حق میں تھے۔ نجیب نے فیصلہ کر دیا کہ سوڈان کو آزادی کا حق حاصل ہے۔ ۱۲ر فروری ۱۹۵۳ء کو مصر و برطانیہ کے اتفاق سے یہ طے ہوگیا کہ زیادہ سے زیادہ تین سال کے عبوری دَور میں پہلا نظام ختم کر دیا جائے اور آزاد نظام اس کی جگہ لے لے۔

اب انتخابات ہوئے تو سید اسماعیل اللازہری کی جماعت الحزب الوطنیۃ الاتحادیہ (نیشنل یونینسٹ پارٹی) کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور سید موصوف ہی نے وزارت بنائی۔ یکم مارچ ۱۹۵۴ء کو پارلیمنٹ کے دوسرے اجلاس کے وقت ایک ناگوار حادثہ پیش آیا یعنی مظاہروں میں کچھ آدمی مارے گئے۔ اس وقت تک سوڈان کی فضا مصر کے حق میں تھی۔ ۱۴ر نومبر ۱۹۵۴ء کو مصری سیاست سے نجیب نکل گیا تو سوڈان کی روش بدل گئی۔ پہلے یہ طے ہوا کہ مستقبل کا فیصلہ رائے عامہ کے ذریعے سے کیا جائے۔ ساتھ ہی دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ہو جائے اور اس اثنا میں تمام جماعتوں کی ملی جُلی حکومت انتظام سنبھالے۔ پھر قرار پایا کہ پارلیمنٹ آخری فیصلہ کر دے۔ وہی دستور ساز اسمبلی کا کام کرے اور سید اسماعیل الازہری نے ملی جُلی حکومت بنالی۔ پارلیمنٹ نے ۱۹ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو سوڈان کی آزادی کا فیصلہ کر دیا۔ یکم جنوری کو آزادی کا اعلان ہُوا اور گورنر کا کام پانچ سوڈانی ممبروں کے سپریم کمیشن نے سنبھال لیا۔
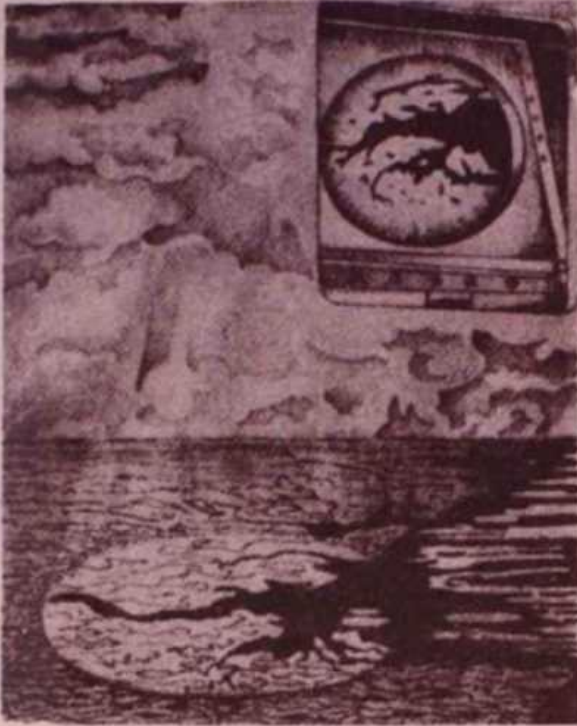
جادُو کی آنکھ ایجاد ہوتی ہے

راڈر

راڈر ہمارے زمانے کی نہایت اہم ایجاد ہے۔ اس سے دُور دُور کی چیزیں دیکھی جا سکتی ہیں اور ان کا درمیانی فاصلہ جلد سے جلد معلوم کیا جا سکتا ہے۔ سخت کُہر یا گھنگھور گھٹا یا رات کی تاریکی، غرض کوئی شے راڈر کی دیکھ بھال کو نہیں روک سکتی۔ اسی لیے راڈر کو عام طور پر جادو کی آنکھ کہا جاتا ہے۔

دُوسری عالمگیر جنگ میں جرمنوں نے ایسے ہوائی جہاز تیار کر لیے تھے، جو ریڈیائی لہروں کی مدد سے چلتے تھے۔ وہ نہایت تیزی سے آتے اور برطانیہ کی آبادیوں پر اندھا دُھند بم برسا کر تباہی پھیلاتے۔ اسی طرح بلجیم سے راکٹ بموں کی بارش ہوتی رہی۔ ضرورت یہ پیش آئی کہ ان جہازوں اور بموں کا پتا وقت سے پہلے لگا لینے کی کوئی تدبیر ہاتھ آنی چاہیے، تاکہ ان کی روک تھام کا مناسب بندوبست ہو سکے، نیز لوگوں کو حفاظت کے لیے خبردار کیا جا سکے۔ انگریز سائنس دانوں نے سوچ بچار اور تجربوں کے بعد راڈر ایجاد کیا، جو تین تین چار چار سو میل کے دائرے میں ہر ہوائی جہاز کی خبر آناً فاناً دے سکتا ہے۔

آپ نے ریڈیو کا آلۂ ترسیل (ٹرانسمٹر) تو دیکھا ہوگا۔ یہ آواز کو ریڈیائی لہروں کے ذریعے دُور دُور پہنچا دیتا ہے۔ ریڈار کی مشین نہایت تیز رفتار اور زوردار شعاعوں کو چاروں طرف فضا میں بکھیرتی اور منتشر کرتی ہے اور جب چاہیں ہم ان شعاعوں کو ایک شعلے کی صُورت میں ایک خاص سمت میں بھی بھیج سکتے ہیں۔ انھیں کوئی شے روک نہیں سکتی، لیکن جب یہ کسی ٹھوس چیز سے ٹکراتی ہیں تو پلک جھپکنے میں واپس آ کر اس چیز کی تصویر مشین کے ساتھ لگے ہُوئے ایک خاص پردے پر نمایاں کر دیتی ہیں۔ باقی رہا یہ امر کہ وہ چیز کتنے فاصلے پر ہے تو یہ جان لینا چنداں مشکل نہیں۔ شعاعوں کے مشین سے نکلنے اور تصویر لے کر واپس آنے کا وقت مشین چلانے والے کو معلوم ہوتا ہے۔ شعاعوں کی رفتار بھی اس پر آشکارا ہوتی ہے۔ پس وہ ایک منٹ

میں شے کے فاصلے کا اندازہ کر لیتا ہے۔ غرض راڈر کی ایجاد کے بعد جرمنوں کے ریڈیائی جہازوں یا راکٹ بموں کا مقابلہ کامیابی سے کیا جانے لگا۔

ایجاد کے بعد ریڈار نے بڑی ترقی کر لی۔ پہلے ہوائی جہازوں اور عام بحری جہازوں کو راستے کی صفائی کے بارے میں اطلاعات حاصل کرنی پڑتی تھیں۔ اب ریڈار کے ذریعے انھیں سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے، اس لیے حادثوں کا سلسلہ بڑی حد تک کم ہو گیا ہے۔

سائنس دانوں نے یہ بھی بہت جلد معلوم کر لیا کہ جن طلسمی شعاعوں سے راڈر میں کام لیا جاتا ہے، وہ بعض جانوروں اور پرندوں سے بھی خود بخود نکلتی رہتی ہیں اور اندھیرے میں انھیں کے ذریعے راستے کی رکاوٹوں کا پتا لگایا جاتا ہے۔ مثلاً چمگادڑ کو دیکھو۔ وہ رات کے وقت اڑتا ہے تو کبھی دیوار یا بجلی کے کھمبے سے نہیں ٹکراتا۔ یہی شعاعیں قبل از وقت رکاوٹ کے بارے میں اسے خبردار کر دیتی ہیں۔ اسی اصول کو سامنے رکھ کر سائنس دانوں نے طلسمی چھڑیاں بنا دیں، جو اندھوں کے لیے بہت ہی ہمدرد رہنما کا کام دیتی ہیں۔ اندھا اس چھڑی کو ہاتھ میں لیے جا رہا ہو، جب رکاوٹ سامنے آئے گی تو چھڑی میں گھنٹی بجنے لگے گی اور اندھے کو آگاہ کر دے گی کہ اسے ایک طرف ہو جانا چاہیے۔ لطف یہ کہ جب تک اندھا سامنے کی رکاوٹ سے بالکل محفوظ نہ ہو جائے گا، گھنٹی بجتی رہے گی۔

کون کہہ سکتا ہے کہ راڈر کل انسانوں کے لیے کن کن نئی برکتوں کا سر چشمہ بن جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے ذریعے اندھے اسی طرح بے تکلف دنیا کے کام کاج کرنے لگیں جس طرح آنکھوں والے کرتے ہیں۔

غرض ہر نئی ایجاد انسانوں کی کسی نہ کسی اہم ضرورت کو پورا کر رہی ہے اور ان کی بے بسی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ ایجادوں کے دو پہلو ہیں، ایک حد درجہ خطرناک، جس سے وسیع آبادیاں موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں، جیسا کہ ایٹم بم کے ذریعے سے ہیروشیما یا ناگاساکی میں ہوا، دوسرا نفع بخش جس سے انسانوں کے بہت بڑے حصے کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کے لیے صرف ریڈار ہی کی مثال سامنے رکھ لیجیے۔

اگر راڈر ایجاد نہ ہوتا تو دشمنوں کے اچانک حملوں سے خود کو محفوظ کر لینے کی کیا صورت تھی؟ یا ہوائی جہازوں کو خطرات سے کیوں کر آگاہی حاصل ہو سکتی تھی؟ پھر راڈر کے دوسرے فائدوں کو پیش نظر لائیے۔ اس کی وجہ سے اندھوں کو کیسا عمدہ سہارا مل گیا؟ ابھی خدا جانے یہ ایجاد اور کون کون سے فوائد کا دروازہ کھولے گی۔ خدا کرے کہ تمام ایجادیں انسانوں کے فائدے کے لیے استعمال ہوں، نقصان کے لیے استعمال نہ ہوں۔

ایشیا اور افریقہ مُتحد ہوتے ہیں

دُنیا کی تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ وہ ہے جب ۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء کو انڈونیشیا کے مشہور شہر بندوگ میں ایشیا اور افریقہ کے انتیس آزاد یا قریباً آزاد ملکوں کے نمائندے جمع ہُوئے اور اُنھوں نے سات روز کے غور و فکر کے بعد اپنے اقتصادی، ثقافتی اور دُوسرے مسائل مِل جل کر حل کرنے کی تجویزیں سوچیں۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جمعیت اقوام بنی تھی جس میں معاملات کی باگ ڈور فرانس و برطانیہ کے قبضے میں رہی۔ دُوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر مجلس اقوام کی بُنیاد رکھی گئی جس کے لیے امریکہ نے سب سے بڑھ کر کام کیا اور اب تک امریکہ ہی کا اثر و رسوخ سب سے زیادہ ہے، لیکن ایشیا اور افریقہ کے آزاد ملکوں کا اتحاد ان براعظموں کی ہزارہا سالہ سرگزشت کا پہلا واقعہ تھا۔

اس کانفرنس کے لیے پاکستان، ہندوستان، برما، سیلون اور انڈونیشیا کے بڑے وزیروں نے دعوت دی تھی اور ان پانچ ملکوں کے علاوہ افغانستان، کمبودیا، جمہوریہ چین، مصر، حبشہ، گولڈ کوسٹ، ایران، عراق، جاپان، شرق اُردن، لاؤس، لبنان، لائبیریا، لیبیا، نیپال، فلپینز، دولت عربیہ سعودیہ، سودان، شام، تھائی لینڈ، ترکی، جمہوریہ ویت نام اور یمن کے نمائندے شریک ہُوئے۔ ابتدائی اجلاس کے بعد مختلف مسائل کے لیے الگ الگ سب کمیٹیاں بنا دی گئی تھیں۔ ۲۴ اپریل کو ان سب کمیٹیوں کی تیار کردہ تجاویز ایک مصدقہ اعلان کی شکل میں شائع کر دی گئیں۔ کانفرنس کا مقصود اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایشیا اور افریقہ کے

تمام ملکوں کے درمیان، اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی تعاون کے رشتے مضبوط ہو جائیں اور وہ اتحاد و اتفاق سے امنِ عالم کی خدمت انجام دیں۔ بڑی طاقتوں کے دبیل نہ بنیں اور جن ملکوں کو ابھی تک آزادی کی نعمت نہیں ملی یا وہ پس ماندہ ہیں، ان کی دست گیری اور امداد میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔

اس کانفرنس کا جو پہلو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، یہ ہے کہ اگرچہ ماضی میں مختلف ملکوں کو بعض بڑی طاقتوں سے تکلیفیں پہنچ چکی تھیں، لیکن کسی کے خلاف بھی رنج یا ملال کا اظہار نہ کیا گیا۔ سب یہی چاہتے تھے کہ تمام ملکوں اور قوموں کے درمیان محبت اور برادری کے رابطے استوار ہو جائیں۔ خواہ وہ مشرق میں رہتی ہوں یا مغرب میں۔ جمہوریہ انڈونیشیا کے محترم صدر نے کانفرنس کے اختتام پر جو تقریر کی، اس میں اس عظیم الشان اجتماع کی رُوح کا نقشہ نہایت اچھے انداز میں پیش کر دیا۔ موصُوف نے فرمایا:-

"ہمیں ماضی کے متعلق اپنے دلوں میں تلخی نہ لانی چاہیئے، بلکہ مستقبل پر نظریں جمانی چاہئیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ خدائے پاک کی نعمتوں میں سے زندگی اور آزادی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ ہم پر واضح رہنا چاہیئے کہ جب تک قومیں یا ان کے کچھ حصے آزادی سے محروم ہیں، پُورے عالمِ انسانیت کی عزت و حُرمت گھٹتی رہے گی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے، انسان کا بلند ترین نصب العین یہ ہے کہ اپنے ہم جنسوں کو خوف اور ملال کی زنجیروں سے نجات دلائے۔ یعنی ان جسمانی، رُوحانی اور ذہنی بندھنوں کو توڑے، جن کے باعث عالمِ انسانیت کی بہت بڑی اکثریت طویل مدت سے پُوری نشوونما حاصل نہیں کر سکی۔ بھائیو اور بہنو، ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم ایشیائیوں اور افریقیوں کا متحد ہو جانا لازم ہے۔
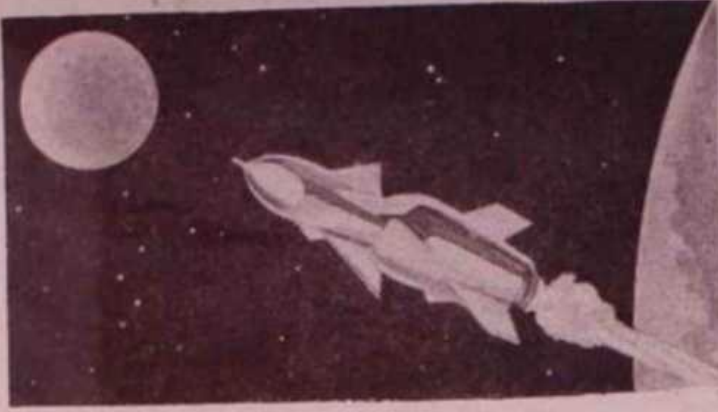
انسان ستاروں کا رُخ کرتا ہے

زمین اپنے پُورے پھیلاؤ کے باوجُود انسان کے لیے تنگ ہو رہی ہے۔ اس نے پہاڑوں کی چوٹیاں پامال کر دیں، سمندر کھنگال ڈالے، برفستانوں میں پھر نکلا، اب مدت سے اس کی نظریں چاند تاروں پر جمی ہُوئی ہیں۔ ہوائی جہازوں نے بلندی میں پرواز کا موقع پیدا کر دیا۔ ایٹم کا راز معلوم ہونے سے نئی قوت ہاتھ آگئی۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ انسان فضا کو چیرنے کے بڑے بڑے منصوبے تیار نہ کرنے لگتا۔

تجربوں نے بتا دیا ہے کہ ہوائی جہاز اسی فضا میں اچھا کام دے سکتے ہیں جہاں ہوا ہے اور ایسی فضا کی بلندی دس میل کے لگ بھگ ہوگی۔ اُوپر ہوا نہایت لطیف ہے یا سمجھنا چاہیئے کہ اس کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہاں ہوائی جہاز کارآمد نہیں ہو سکتے۔ صرف راکٹ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ راکٹ ہی کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنانے کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔

راکٹ کے اصول تو پہلے سے معلوم تھے، لیکن اس سے فضا میں کام لینے کی طرف توجہ موجودہ صدی کے آغاز میں ہوئی۔ پہلے رُوس کے ایک سائنسدان نے اس کے متعلق ایک کتاب لکھی، پھر آسٹریا، جرمنی، برطانیہ، فرانس، امریکہ اور دوسرے ملکوں کے سائنس دان تجربے کرنے لگے، جگہ جگہ سوسائیٹیاں بھی بن گئیں۔ اب اُمید پیدا ہو گئی ہے کہ چند سال میں راکٹ کو دُنیا سے چاند کی طرف بھیجا جائے گا۔

لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اصل کام چنداں آسان نہیں، اس میں بڑی مشکلات ہیں۔ پہلی مشکل یہ ہے کہ راکٹ میں اتنی قوت پیدا کر لی جائے جس کی بنا پر وہ کشش ثقل کے دائرے سے باہر جا سکے اور ایسی فضا میں پُہنچ جائے جہاں یہ کشش اس کا دامن نہ کھینچ سکے۔ ایک جرمن سائنس دان نے عملی تجربے سے ثابت کر دیا ہے کہ اگر کوئی شخص راکٹ میں پرواز شروع کر کے آٹھ منٹ میں پچیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار پر پہنچ جائے تو اس پر کوئی بُرا اثر نہیں ہوتا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بلندی میں جہاں ہوا حد درجہ لطیف ہے یا بالکل نہیں، وہاں سانس لینے کی کیا صُورت ہوگی۔ اس مشکل کو آکسیجن کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہے۔

ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ بالائی فضا میں برقی حرارت کی ایک ایسی تہ موجود ہے، جس میں راکٹ یا جہاز کے جل جانے کا خطرہ ہے۔ نیز وہاں تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہتے ہیں جنھیں ہم "شہاب ثاقب" کہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر زمین پر نہیں پہنچتے اور کرہ

ہوائی سے اُوپر ہی اُوپر ان کا رُخ کسی دُوسری طرف ہو جاتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی ستارا جہاز سے یا راکٹ سے ٹکرائے تو اُسے تباہ یا بیکار نہ کر ڈالے گا۔ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ چاند یا کسی ستارے میں پہنچ جانے کے بعد وہاں کی فضا کیسی ہوگی انسان وہاں اُتر بھی سکے گا یا نہیں اور اُتر جائے گا تو کچھ دیر ٹھہرنے کی صُورت بھی پیدا کرے گا یا ختم ہو جائے گا؟ ان تمام مرحلوں کو خیر و خوبی سے طے کر لیا جائے تو آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ستارے سے واپسی کے سفر کی تدبیر کیا ہوگی اور روانگی کا کوئی بند و بست ہو بھی جائے تو کیا انسان اس زمین پر پہنچ سکے گا۔

فی الحال چاند، مریخ اور زہرہ ستارے کی طرف جانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ باقی ستارے سورج سے اتنے دُور ہیں کہ ان کا درجۂ حرارت صفر سے بھی کم و بیش دو سو درجے نیچے ہونا چاہیئے۔ گویا ان میں زندگی بحال رہنے کی بظاہر کوئی صُورت نہیں اور ان کا فاصلہ بھی اتنا ہے کہ انسان موجودہ اسباب کی بنا پر ان کا قصد نہیں کر سکتا۔

بہر حال ہمت ور لوگ ان مُشکلات پر قابو پانے کی کوشش میں لگے ہُوئے ہیں، تاکہ ایسا راکٹ تیار کر لیا جائے جو منزلِ مقصود پر پہنچ بھی جائے اور واپس بھی آجائے۔ ایسے جوانمرد بھی موجود ہیں جو مَوت سے بے پروا ہو کر اس سفر کے لیے نام پیش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے چند سال میں انسان فضا میں بھی اسی طرح پھرنے لگے جس طرح آج کل خشکی پر اور پانی میں پھر رہا ہے۔ امریکہ راکٹ کو ایک سو ساٹھ میل کی بلندی تک بھیجنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اور ایسے تجربوں میں بالائی فضا کے متعلق قیمتی معلومات بھی حاصل ہو رہی ہیں۔

(کتاب زیرِ طبع تھی کہ اعلان ہُوا روسی راکٹ چاند میں پہنچ گیا ہے۔ اس پر کوئی آدمی سوار نہ تھا۔)

پاکستان کا نصب العین پیش ہوتا ہے

آل انڈیا مسلم لیگ کا جو اجلاس ۱۹۳۰ء میں بمقام الٰہ آباد ہُوا تھا، وہ اس وجہ سے ہمیشہ یاد رہنے والا اجلاس ہے، کہ اسی کے خطبۂ صدارت میں علامہ اقبالؒ نے پہلی مرتبہ ایک آزاد اسلامی دولت کی صدا بلند کی تھی اور مسلمانوں کے سامنے ایک ایسا نصبُ العین پیش کیا تھا جسے پُورا کر لینے پر ان کے مستقبل کی درخشانی موقوف تھی۔ یقیناً اسی خطبے کو پاکستان کا بنیادی پتھر قرار دینا چاہیئے۔

اس زمانے میں ہندوستان کے حالات مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے بڑے ناخوشگوار اور حد درجہ تشویش ناک تھے۔ یہاں وہ جمہوری نظام جاری ہو چکا تھا جس میں مختلف قوموں کے لیے اپنے مخصوص نظریات کے مطابق آزادانہ نشوونما کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ جو قومیں تعداد میں تھوڑی تھیں ان کی آزادی خطرے میں پڑی ہوئی تھی۔

مُسلمان اگرچہ ہر نقطۂ نگاہ سے ایک جُداگانہ قوم تھے، لیکن پُورے ہندوستان میں وہ زیادہ سے زیادہ ایک چوتھائی تھے۔ ہندوستان متحد رہتا تو ایک چوتھائی آبادی کے لیے اپنی زندگی اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کیا صُورت تھی۔ اُنھوں نے مقاصدِ آزادی کو پیش نظر رکھ کر اکثریت کے ساتھ سمجھوتے کی جتنی کوششیں کیں وہ سب ایک ایک کر کے ناکام ہو چکی تھیں۔ وطن کی آزادی کا مطالبہ پیش تھا، جس کے لیے مُسلمان بیش بہا قربانیاں کر چُکے تھے۔ تاہم اگر مسلمانوں کی آزادی کا کوئی بندوبست نہ ہوتا تو کروڑوں مسلمانوں کا مستقبل ختم ہو جاتا اور دُنیا بھر میں اتنے مسلمان کہیں آباد نہ تھے، جتنے ہندوستان میں آباد تھے۔ صُورتِ حال ایسی تھی کہ نہ تو مسلمان آزادی سے بے پروا ہو سکتے تھے اور نہ جانتے بُوجھتے ہُوئے تباہی کے غار میں گر سکتے

تھے۔ اس نازک موقع پر جس رہنمائی کی ضرورت تھی، اس پر سب کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ عین اس وقت خدا نے علامہ اقبالؒ کی زبان پر وہ کلمہ جاری کیا جو آگے چل کر یہاں کے مسلمانوں کی تقدیر کا فیصلہ بننے والا تھا۔

علامہ مرحوم نے خطبۂ صدارت میں حالات کا نقشہ بڑے ہی اچھے انداز میں پیش کیا۔ مسلمان لیڈر اس وقت تک اپنے قومی مسئلے کے حل کی جتنی تجویزیں پیش کر چکے تھے، علامہ نے ان سب کی تعریف کی ساتھ ہی فرمایا کہ جس حد تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو ان تجویزوں سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔

"میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد دولت قائم کر دی جائے۔ ملک کو خود اختیاری حکومت زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمالی و مغربی ہند میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقے کے مسلمانوں کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔"

پھر فرمایا:-

"ہندوستان دُنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ مل جائے۔ مسلمانانِ ہند کے زندہ اور جاندار طبقے میں .... اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو اس طرح نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔"

اُس زمانے میں مختلف لوگوں نے سمجھا کہ یہ ایک شاعر کا خواب ہے اور مسلمان لیڈر اکثریت کے ساتھ سمجھوتے کی کوششوں میں برابر لگے رہے لیکن آخر سب کو اسی نقطے پر آنا پڑا، جہاں علامہ اقبالؒ ۱۹۳۰ء میں پہنچ چکے تھے اور جسے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تقدیر قرار دے چکے تھے۔ دس سال بعد علامہ مرحوم ہی کی صدائے حق مسلمانوں کی قومی زندگی کا ترانہ بن گئی۔

انسان مونٹ ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچتا ہے

انسان نے جب سے رُوئے زمین پر قدم رکھا ہے، وہ کائنات کی تسخیر میں لگا ہُوا ہے۔ اس نے خدا کی دی ہوئی عقل و ہمت سے کام لے کر جو عظیم الشان کارنامے سرانجام دیئے وہ انسانیت کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہیں۔ اس نے سمندروں کے سینے چیرے، پہاڑوں کی دیواریں پھاندیں، چھان بین کی مشعل لے کر برفستانوں میں پہنچا، زمان و مکان کی حدیں ختم کرنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اب اس کی نظریں بلندی پر جمی ہوئی ہیں۔ غرض تسخیرِ کائنات کا سلسلہ جاری ہے اور جب تک قدرت نے اسے زندگی کی مہلت عطا کر رکھی ہے، یہ سلسلہ بدستور جاری رہے گا۔

ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی مونٹ ایورسٹ دُنیا کی سب سے بلند چوٹی ہے۔ اگر اسے زمین پر پھیلا دیا جائے تو لمبائی میں پانچ میل سے زیادہ جگہ گھیرے گی۔ اس چوٹی پر پہنچنے کے لیے ۱۹۲۱ء سے مہموں کا آغاز ہُوا۔ ہر مہم میں قیمتی معلومات حاصل ہوتی رہیں۔ مئی ۱۹۲۲ء میں انسانی قدم پچیس ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ گئے تھے۔ آگے سفر جاری نہ رکھا جا سکا۔ کچھ دیر سستانے کے بعد پھر بعض من چلے لوگ اس عزم کے ساتھ روانہ ہُوئے کہ وہ چوٹی پر پہنچ کر دم لیں گے۔ وہ ستائیس ہزار فٹ پر پہنچ کر رُکے، آخر انھیں بھی لَوٹنا پڑا۔ واپسی کے سفر میں کچھ جانیں بھی تحقیقات کی نذر ہوگئیں۔ مونٹ ایورسٹ کی سنسان خاموشی میں انسانی قدموں کی جو ہلکی سی آہٹ سُنی گئی تھی، وہ آنسوؤں پر ختم ہوگئی۔

۱۹۲۴ء میں پھر ایک مہم تیار ہوئی۔ اس مہم

نے چھبیس ہزار فٹ کی بلندی پر پڑاؤ کا انتظام کیا۔ ان میں سے ایک روز دو بہادر اُوپر چڑھنے لگے اور اٹھائیس ہزار فٹ پر پہنچ گئے۔ یکایک ایک کا گلا کھر کے باعث خراب ہوگیا۔ دوسرا رات کو بھلا چنگا سویا، صبح اٹھا تو برفستانی ہوا نے اس کی بینائی چھین لی۔ وہ لوگ واپس ہوئے تو دو اور آدمی منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہو گئے۔ چوٹی صرف آٹھ سو فٹ رہ گئی تھی، پھر ان کا کوئی سُراغ نہ مل سکا۔ اس طرح یہ مہم بھی ناکام رہی۔

مونٹ ایورسٹ برابر جانوں کی قُربانی لے رہی تھی، لیکن قربانیاں دینے والے بھی ہر مرتبہ اس ارادے کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے تھے کہ دُنیا کی اس سب سے بڑی چوٹی کو مسخر کیے بغیر دم نہ لیں گے۔ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۶ء میں اور اس کے بعد بھی کئی مہمیں مونٹ ایورسٹ کو فتح کرنے کے لیے گئیں۔ آخر ۱۹۵۳ء میں ایک مہم کرنل سر جان ہنٹ[1] کے زیرِ سرکردگی روانہ ہوئی، جس میں آسٹریلیا کا ایک کوہ پیما ایڈمنڈ ہلاری[2] اور نیپال کا ایک بہادر شرپا تن سنگھ[3] بھی شامل تھے۔ ہلاری اور تن سنگھ جانیں ہتھیلیوں پہ رکھ کر نکلے اور تمام مشکلات و مصائب سے مردانہ وار گزرتے ہُوئے ۲۹ رمئی ۱۹۵۳ء کو مونٹ ایورسٹ کی چوٹی پر جا پہنچے۔ کچھ دیر وہاں گزار کر بخیر و عافیت واپس آگئے۔ اس طرح بتیس سال کی جد و جہد کے بعد دُنیا کی بلند ترین چوٹی کو انسان نے مسخر کر لیا۔ سچ ہے:

وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمّت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

کتنے خوش نصیب ہیں وہ قدم جو سب سے پہلے مونٹ ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچے اور کتنے خوش نصیب ہیں وہ انسان جنھوں نے سب سے پہلے اس کی فضا میں سانس لیا۔

۱- Sir John Hunt ۲- Edmund Hillary ۳- Sherpa Tansing

ہندوستان آزاد ہوتا ہے

ہندوستان پر انگریزی حکومت کا آغاز ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی سے ہوا اور قریباً نوّے سال میں پورا ملک انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ ان کی کامیابی کا خاص راز یہ تھا کہ وہ دیسی حکمرانوں کے پردے میں قدم آگے بڑھاتے رہے۔ کبھی انھیں آپس میں لڑا دیتے اور ایک کے طرف دار بن کر پہلے دوسرے کو ختم کرتے، پھر اپنے ساتھی کو بے بس بنا کر رکھ دیتے، لیکن اسی زمانے سے جوانمردوں نے انگریزی حکومت کے خلاف کوششیں شروع کر دی تھیں۔ میر قاسم، حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے کارنامے سب پر آشکارا ہیں۔

جب فرمانرواؤں میں جہادِ آزادی کی رُوح باقی نہ رہی تو عوام نے قدم آگے بڑھایا۔ اس سلسلے میں سید احمد شہید اور ان کے رفیقوں نے جو قربانیاں کیں وہ ہماری تاریخ کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ ہزاروں نے لڑتے ہوئے شہادت پائی، بے شمار لوگوں نے قیدیں کاٹیں، جائدادیں ضبط کرائیں، انڈیمان کے سنسان جزیرے میں زندگی کے دن پورے کیے، لیکن جب تک انگریز ہندوستان سے نکل نہ گئے، سید صاحب کی جماعت بڑی تھی یا چھوٹی، ہندوستان کے اندر اور باہر آزادی کے لیے سرگرم عمل رہی۔

۱۸۵۷ء کا جہاد بھی آزادی ہی کے لیے تھا، جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا، اگرچہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کے انجام پر انگریزوں کا عتاب بھی سب سے بڑھ کر مسلمانوں پر ہی نازل ہوا اور انھیں جو جانی اور مالی نقصان اُٹھانا پڑا، اس

کا صحیح اندازہ پیش کرنا مشکل ہے۔ مسلمان ایک ہزار سال یہاں حکمران رہ چکے تھے۔ کیا ان کے پاس بڑی بڑی جائدادیں اور بیش قیمت سرمائے نہ تھے؟ وہ کہاں گئے؟ اس دولت کو کون کھا گیا؟ اپنے مال کو کوئی بھی ریت کے ذرّوں کی طرح نہیں بکھیرتا، لیکن مسلمانوں کے کانوں میں جب وطن کو آزاد کرانے کی صدا پہنچی تو وہ ہر چیز سے بے پروا ہوکر ادائے فرض کے لیے میدان میں نکل آئے، یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ بحیثیت قوم ہندوستان میں سب سے زیادہ غریب رہ گئے۔ ان کی قربانیاں مُلک کی آزادی کے لیے تھیں۔

۱۸۸۵ء میں کانگرس کی بُنیاد رکھی گئی جس نے آخری دَور میں مُلکی آزادی کے لیے بہت کام کیا، لیکن جب تک مسلمان میدانِ عمل میں نہ آئے کانگرس کی حیثیت ایک بے رُوح جسد کے سوا کچھ نہ تھی۔ وہ پینتیس سال تک محض قرار دادیں منظور کرتی رہی۔ ۱۹۱۹ء میں ترکِ موالات کی تحریک جاری ہوئی اور مسلمانوں کا جوشِ جہاد بروئے کار آیا تو کانگرس ملک کی سب سے بڑی اور طاقتور عوامی جماعت بن گئی۔ اگرچہ مسلمان ملک کی کل آبادی کی صرف ایک چوتھائی تھے، لیکن ترکِ موالات کی تحریک میں جو لوگ قید ہوئے ان میں سے اسی فیصد مسلمان تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں آزادی کے لیے قربانیوں کا ولولہ کتنا زیادہ تھا۔

ترکِ موالات کے بعد بھی تحریکِ آزادی میں کئی نشیب و فراز آئے۔ مدّوجزر کی کئی حالتیں اس پر طاری ہوئیں، لیکن کمان سے نکلا ہُوا تیر واپس نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہُوا۔ انگریز آہستہ آہستہ اختیارات چھوڑتے گئے اور ملکی مطالبے میں زیادہ سے زیادہ قوت پیدا ہوتی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اجنبی حکومت ایک وہم ہوتی ہے۔ یہ وہم دلوں پر مسلّط رہتا ہے تو کسی کو اُٹھنے کا خیال بھی نہیں آتا۔ وہم زائل ہو جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیند سے یکایک آنکھیں کُھل گئیں۔ جب آنکھیں کُھل جائیں تو انھیں کسی بھی تدبیر سے دوبارہ بند نہیں کیا جاسکتا۔

آخر انگریزوں کو مستقبل کے متعلق ایک واضح فیصلہ کرنا پڑا۔ وہ جانتے تھے کہ کروڑوں کی آبادی پر پہرے کوئی بھی نہیں بٹھا سکتا۔ اُٹھتے ہُوئے طوفانِ آزادی کو روک دینا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ انھوں نے آزادی کی تاریخ مقرر کردی اور ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوگیا۔ اس طرح دو آزاد ملک، پاکستان اور بھارت وجود میں آئے۔ یہ مسرّت و شادمانی کا نادر موقع تھا، مگر افسوس کہ آخری دَور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے معاملات کا تصفیہ نہ ہونے کے باعث سخت ناخوشگوار حالات پیدا ہوگئے اور مسرّت و شادمانی کی صُبح کا دامن آگ اور خون کے دھبّوں سے داغدار ہوگیا۔

سب سے بڑا اِسلامی مُلک وجُود میں آتا ہے

پاکستان کی تحریک مسلم لیگ کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ مسلم لیگ کی بنیاد ۱۹۰۶ء میں رکھی گئی تھی۔ اس کی زندگی کے تین دَور ہیں۔ پہلے دَور میں وہ مسلمانوں کی جُداگانہ قومی ہستی منوانے کے لیے کوشاں رہی اور مسلمانوں کے لیے جُداگانہ انتخاب منظور کرایا۔ اسی بنا پر ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا جو "میثاقِ لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہے۔ دُوسرے دَور میں مسلم لیگ کی کوشش یہ رہی کہ کانگرس کے ساتھ ایسا سمجھوتا ہو جائے جس میں مسلمانوں کے جُداگانہ قومی حقوق کے لیے کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ اس سمجھوتے سے بالکل نا امیدی ہوگئی تو مسلم لیگ نے قائدِاعظم کی سرکردگی میں آزاد اسلامی حکومت کا نعرہ بلند کیا اور وہ اپنی زندگی کے تیسرے دَور میں داخل ہوگئی۔

آزاد حکومت کی قرارداد مسلم لیگ نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے اجلاس لاہور میں منظور کی تھی۔ اس وقت سے اسلامی سیاست کا رُخ بدلا اور مسلمانوں نے ملی جُلی حکومت بنانے کا خیال ترک کر کے اپنی مستقل حکومت کے لیے جد و جہد شروع کی۔

مسلمانوں کو ایک روشن نصبُ العین مِل گیا تھا۔ قائدِاعظم تحریک کے علمدار تھے جن کے خلوص، تدبّر اور عزم و ہمت کی اس ملک کا ذرّہ ذرّہ گواہی دے رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں انگریزوں کو بھی یقین ہو گیا کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ مسلمانوں کو مطمئن کیے بغیر طے نہیں ہو سکتا۔ یہ تحریکِ پاکستان کی کامیابی کا پہلا سنگِ میل تھا۔

اب حکومت اور کانگرس کی طرف سے یہ کوششیں ہونے لگیں کہ کسی طرح مسلم لیگ کو راضی کر کے تقسیم

کو روکا جائے۔ مسلمانوں کی طرف سے تنہا قائدِ اعظم ترجمانی فرما رہے تھے۔ اُنھوں نے ہر موقع پر یہی کہا کہ مسلمان کسی بھی طبقے کا کوئی جائز حق چھیننا نہیں چاہتے۔ انھیں خدا نے ایک مستقل قوم کی حیثیت عطا کی ہے۔ اس حیثیت کو تسلیم کرو، ملک کو دو حصّوں میں بانٹ دو، ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور دوسرے میں غیر مسلموں کی۔ دونوں حصّوں کی اقلیتوں کے تمام حقوق پُوری طرح محفوظ ہو جانے چاہییں۔

آخر یہ فیصلہ ہوا کہ ملک بھر کی قانون ساز مجلسوں کے انتخابات نئے سِرے سے ہوں اور جو نمایندے چُنے جائیں، اُن کی مرضی کے مطابق ملک کے آیندہ نظام کا فیصلہ کر دیا جائے۔ انتخابات کا مقصد یہ تھا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے اثر و اقتدار کی حقیقی حیثیت واضح ہو جائے۔ ۱۹۴۶ء میں انتخابات ہُوئے۔ مسلمانوں کی بہت زیادہ نشستیں لیگ کے قبضے میں آگئیں اور غیر مسلموں کی اکثر نشستوں پر کانگرس قابض ہو گئی۔ ان میں سے دس فیصد نمائندے دستور ساز اسمبلی کے لیے منتخب ہونے تھے۔ غیر مسلموں کی کل نشستیں دو سو دس تھیں، جن میں سے دو سو ایک کانگرس کو ملیں۔ مسلمانوں کی کل نشستیں اٹھتر تھیں، ان میں سے تہتر لیگ کے حصّے میں آئیں۔ یہ اس حقیقت کا آخری ثبوت تھا کہ ملک کے مستقبل کا فیصلہ صرف لیگ اور کانگرس کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔ تیسری کسی جماعت کو توجہ کے قابل نہیں سمجھا جا سکتا۔

جب واضح ہو گیا کہ مسلم لیگ تقسیم ملک کے سوا راضی نہ ہو گی تو مخالفوں نے یہ فتنہ کھڑا کر دیا کہ پنجاب اور بنگال کے جن اضلاع میں غیر مسلموں کی تعداد زیادہ ہے انھیں الگ کر کے ہندوستان میں شامل کر لیا جائے۔ حکومت نے یہ مطالبہ مان لیا۔ دراصل وہ تقسیم کو روکنا چاہتی تھی۔ اب مسلم لیگ کے سامنے دو راستے تھے: ایک یہ کہ تقسیم کا مطالبہ چھوڑ کر ملی جُلی حکومت بنانے پر راضی ہو جائے۔ دُوسرا یہ کہ جتنے اسلامی خطّے کو آزاد کرایا جا سکتا تھا، آزاد کرا لیا جائے۔ لیگ نے غور و فکر کے بعد دُوسرا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ اس کے مطابق ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ملک کی تقسیم کے متعلق حکومت کا اعلان جاری ہو گیا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو انگریزی حکومت ختم ہو گئی۔ متحدہ ہندوستان کی جگہ دو آزاد حکومتیں وجود میں آگئیں، ایک پاکستان، دوسری ہندوستان۔ حد بندی کے کمیشن نے ۱۷ اگست کو اپنا فیصلہ سُنایا اور کم از کم سات ایسی تحصیلیں ہندوستان کے حوالے کر دیں جن میں مسلمانوں کی تعداد سب قوموں سے زیادہ تھی اور ان کی حدیں پاکستان سے ملی ہوئی تھیں۔ اس غلط فیصلے اور بعض مفسد گروہوں کی فتنہ انگیزی سے قتل و غارت کا ایک ایسا افسوس ناک دَور شروع ہو گیا جس نے آزادی کی شادمانیوں کو آنسوؤں اور آہوں میں تبدیل کر دیا۔ لاکھوں انسانوں کو ان کے آبائی وطن سے اُٹھا کر پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا، تاکہ اس نئی حکومت کی مُشکلات زیادہ سے زیادہ بڑھ جائیں۔ اس غم نے قائدِ اعظم کی صحت برباد کر دی، تاہم جو قدم اُٹھ چکا تھا، اس کا پیچھے ہٹنا غیر ممکن تھا۔ قائدِ اعظم کی ہمت اور عام پاکستانیوں کے صبر و استقامت سے تمام مُشکلوں پر قابو پا لیا گیا اور وہ جمہوری دولت ایک روشن حقیقت بن گئی جو اس دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت ہے۔

اِنڈونیشیا خود مُختار ہوتا ہے

انڈونیشیا کا پہلا نام جزائر شرق الہند تھا، اس لیے کہ یہ کم و بیش تین ہزار چھوٹے بڑے جزیروں کا مجموعہ ہے جو ہندوستان کے مشرق میں واقع ہیں۔ یہ علاقہ کم و بیش تین ہزار میل لمبا، ایک ہزار تین سو میل چوڑا ہے۔ رقبہ سات لاکھ نوّے ہزار میل کے قریب اور آبادی آٹھ کروڑ سے اُوپر ہے۔ جاوا، سماٹرا اور بورنیو بڑے بڑے جزیرے ہیں۔ انڈونیشیا کی زمین بڑی زرخیز اور کھیتی باڑی کے لیے بہت موزوں ہے۔ گنّا یہاں بکثرت پیدا ہوتا ہے اور کھانڈ بہت بنتی ہے، یہاں تک کہ ایک زمانے میں عام لوگوں نے یہاں کی کھانڈ کا نام ہی جاوا رکھ دیا تھا۔ معدنیات سے بھی یہ ملک مالا مال ہے اور مسالوں کے لیے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ ابتدا میں ہندوستان اور ملایا سے لوگ نکل نکل کر ان جزیروں میں آباد ہوتے رہے۔ اسلام کا ظہور ہوا تو عرب تاجروں نے جگہ جگہ تجارتی کوٹھیاں بنالیں۔ ان کے ذریعے اسلام کی تبلیغ ہوئی اور بہت بڑی آبادی مسلمان ہوگئی۔

یورپی قوموں میں سے پہلے پہل پرتگیز مسالوں کی تجارت کے لیے انڈونیشیا پہنچے پھر ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پوری تجارت سنبھال لی اور وہ انڈونیشیا پر قابض ہوگئی۔ ۱۷۹۸ء میں کمپنی ٹوٹی تو ہالینڈ کی حکومت نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۱۹۴۲ء تک ولندیز یہاں حکمران رہے ویسے برائے نام ان کی حکمرانی کا سلسلہ ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔

آزادی کی تحریک تو ملک میں پہلے سے جاری تھی۔ دوسری جنگ عالمگیر میں جرمنی ہالینڈ پر قابض ہوگیا اور ملکۂ ہالینڈ، انگلستان جا بیٹھی تو اس نے ۷ دسمبر ۱۹۴۲ء کو اعلان کر دیا کہ آیندہ کے لیے ہالینڈ کے تمام مقبوضہ علاقوں کو وہی درجہ حاصل ہوگا جو ہالینڈ کو حاصل ہے۔ اس طرح انڈونیشیا

کا درجہ ہالینڈ کے برابر ہوگیا۔ جب جاپان نے بڑے بڑے جزیروں پر قبضہ جما لیا تو اس نے اپنی حیثیت مستحکم کرنے کی غرض سے لوگوں میں ہتھیار بھی تقسیم کر دیئے اور آزادی کا یقین بھی دلا دیا۔ مقصود یہ تھا کہ وہ جاپان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائیں، بلکہ اس کے مقاصد کو ہر ممکن ذریعے سے تقویت پہنچاتے رہیں۔

جنگ ختم ہوگئی۔ ملکہ ہالینڈ واپس پہنچ گئی اور حکومت کا نقشہ نئے سرے سے درست ہوا تو حکومت ہالینڈ کی نیت بدل گئی، لیکن جو لوگ آزادی کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے اور اب لڑنے مرنے کو تیار تھے، انھیں دھوکا دینا آسان نہ تھا، لہٰذا ۱۹۴۶ء میں ہالینڈ اور اہل انڈونیشیا کے درمیان ایک سمجھوتا ہوا جس کے مطابق ۱۹۴۹ء تک انڈونیشیا میں متحدہ ریاستوں کا سا نظام جاری کر دینے کا فیصلہ ہوگیا۔ تاہم ہالینڈ کی کوشش یہ تھی کہ مختلف ٹکڑوں میں جداگانہ حکومتیں قائم کرا کے انھیں براہ راست اپنے ساتھ وابستہ کرلے اور تمام علاقوں کو متحدہ نہ ہونے دے۔

بڑی دیر تک گفتگو جاری رہی، لیکن فریقین کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ ۲۷ر جولائی ۱۹۴۹ء کو ولندیزی فوجیں مختلف مرکزوں سے نکلیں اور ملک پر از سر نو قبضہ کر لینے کی مہم شروع ہوگئی۔ انڈونیشیا کے لیڈروں نے مقابلہ شروع کر دیا۔ یکم اگست کو انجمن اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ایک قرارداد منظور کی کہ دنیا کا امن خطرے میں پڑ گیا ہے، اس لیے جنگ فوراً بند کی جائے۔ تین آدمیوں کی ایک کمیٹی ثالثی کے لیے مقرر کر دی گئی، جو بلجیم، آسٹریلیا اور جمہوریہ امریکہ کے نمایندوں پر مشتمل تھی۔

۲۳ر اگست سے ۲ر نومبر ۱۹۴۹ء تک حکومت ہالینڈ اور اہل انڈونیشیا کے نمایندوں کے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔ آخر فیصلہ ہو گیا اور ۲۸ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو ہالینڈ نے تمام اختیارات ریاست ہائے متحدہ انڈونیشیا کے حوالے کر دیئے۔ یوں آزادی کی مہم کامیابی کی منزل پر پہنچ گئی۔ پہلے نظام حکومت وفاقی رکھا گیا تھا، پھر اسے وحدانی بنا دیا گیا۔ ۱۴ر اگست ۱۹۵۰ء کو عارضی دستور منظور ہوا۔ ۲۸ر ستمبر ۱۹۵۰ء کو انڈونیشیا انجمن اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔ جمہوریہ انڈونیشیا ایشیا کی بہت بڑی جمہوریت ہے۔

دُنیا کو ساتواں برِّ اعظم ملتا ہے

جب ہم سنتے ہیں کہ امریکہ پندرھویں صدی میں دریافت ہوا تھا تو سوچتے ہیں کہ نئے برِ اعظم کا نام لوگوں کے کانوں میں پہلے پہل پہنچا ہوگا تو ان کے دلوں کی کیفیت کیا ہوتی ہوگی، لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ خود ہماری آنکھوں کے سامنے ایک بہت بڑا برِ اعظم دریافت ہو رہا ہے یا کہیے کہ اس کے حالات تاریکی سے روشنی میں آ رہے ہیں اور اس دریافت کے ساتھ ہمارے دل میں کوئی خاص دلچسپی پیدا نہیں ہوتی، حالانکہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دریافت دُنیا کے عام حالات پر کتنا گہرا اثر ڈالے گی۔

یہ ساتواں برِ اعظم ہے جو قطبِ جنوبی کو گھیرے ہوئے ہے۔ بیسویں صدی میں اس کی چھان بین کے لیے جو مہمیں بھیجی گئیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ برِ اعظم کم از کم پچاس لاکھ مربع میل ہوگا۔ یاد رہے کہ یورپ کا رقبہ صرف ساڑھے سینتیس لاکھ مربع میل ہے۔ گویا نیا برِ اعظم ایشیا، امریکہ اور افریقہ کے بعد رقبے میں چوتھے درجے کا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے تمام حصّوں کا پتا لگایا جائے تو یہ پچاس لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ نکلے۔ ۱۹۴۷ء تک امریکہ نے صرف چار لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل کا ملکی نقشہ تیار کیا تھا۔

اس پر سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں میل تک برف ہی برف چلی جاتی ہے: برف کے پہاڑ، برف کے دریا، برف کے سیکڑوں میل لمبے سلسلے اور برفستانی جانور، وہیل مچھلیاں، قطبی ریچھ، دریائی بچھڑے۔ قطب شمالی کی طرح یہاں بھی چھ مہینے کا دن ہوتا ہے اور چھ مہینے کی رات۔ جب دن ہوتا ہے تو افق پر ہلکی سی تاریکی نمودار ہوتی ہے کہ دن بیت گیا اور اب رات آنے والی ہے اور جب رات ہوتی ہے تو خفیف سی روشنی کی جھلک یہ بتا دیتی ہے کہ دن نکل آیا اور رات ختم ہوئی۔

اس برِ اعظم کی دریافت کا سلسلہ اٹھارھویں صدی ہی میں شروع ہو گیا تھا، لیکن باقاعدہ مہمیں ۱۹۰۱ء سے جانے لگیں۔ جنوری ۱۹۱۲ء میں اسکاٹ قطبِ جنوبی پر پہنچا، لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس سے پیشتر ناروے کا ایک من چلا آدمی وہاں اپنے ملک کا جھنڈا گاڑ چکا تھا۔ واپسی میں اسکاٹ اور اس کے ساتھی برفستانی ہوائیں ایسے چلنے

کہ ایک رات کو خیموں میں بیٹھے لیٹے ان کے جسم اکڑ گئے۔ اسی طرح اور لوگوں نے بھی علم و اکتشاف کی راہ میں جانیں دیں، مگر مہموں کا سلسلہ نہ رُکا۔ اب تو ایسے سامان ہاتھ آگئے ہیں کہ ان کی مدد سے بہت سی مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ مثلاً معلوم ہوا تھا کہ وہیلوں کی کھاڑی کا نقشہ بدل رہا ہے اور اس کا دہانہ کسی روز برف کے باعث بند ہو جائے گا۔ ۱۹۴۷ء میں امریکہ سے جو مہم گئی اس کے ساتھ برف کاٹنے والا جہاز بھی تھا جس کی مدد سے دہانے کی دونوں طرفوں سے برف کا بہت بڑا حصّہ کاٹ کر اسے چوڑا کر دیا گیا۔ برف کی یہ تہیں بیس فٹ سے پچاس فٹ تک موٹی تھیں۔ اس مہم نے یہ پتا بھی لگایا کہ پہلے جس مقام کو قطب جنوبی کا مرکزی نقطہ سمجھا گیا تھا، وہ صحیح نہیں تھا۔ اصل نقطہ اس سے ڈیڑھ سو میل شمال مغرب میں نکلا۔ بڑے بڑے ہوائی جہازوں سے بھی اکتشاف میں مدد لی جارہی ہے۔

قطب شمالی اور قطب جنوبی میں بہت فرق ہے۔ مثلاً قطب شمالی کے برف زاروں میں کم و بیش ایک لاکھ انسان رہتے ہیں۔ وہاں بہت سے جانور پائے جاتے ہیں اور ایسے جنگلات موجود ہیں، جن کی لکڑی بہت قیمتی ہوتی ہے۔ قطب جنوبی میں نہ ایسی کوئی آبادی ہے، نہ وہیل مچھلی اور دریائی بچھڑے یا ریچھ کے سوا کوئی جانور ہے اور نہ درخت ہیں۔ البتہ ایسے سلسلہ ہائے کوہ ضرور ملتے ہیں جن کی اونچائی پندرہ پندرہ بیس بیس ہزار فٹ ہے۔ پہاڑ انھیں صرف اونچائی کے سبب سے کہا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ ٹیلے نہ ہوں، محض برف کے تودے ہی ہوں۔

آج کل اس برِّاعظم کی چھان بین کے لیے بہت سی قوموں کے سائنسدان پہنچے ہوئے ہیں اور مِل جُل کر کام کر رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ ضروری باتیں دریافت کرنے میں کامیاب ہوگئے تو بالکل ممکن ہے قطب جنوبی کا برف زار بھی اسی طرح آہستہ آہستہ آباد ہو جائے جس طرح امریکہ، آسٹریلیا اور دُوسرے بے شمار جزیرے گزشتہ تین چار صدیوں میں آباد ہوگئے۔

سو بڑے آدمی
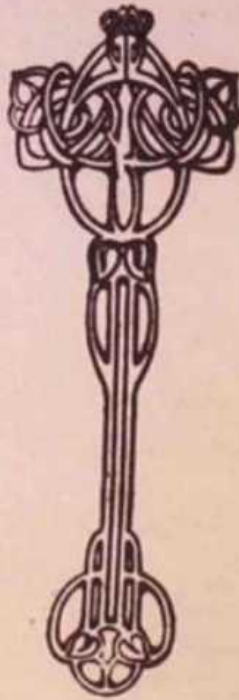
با تصویر

- محمد صلی اللہ علیہ وسلم
- ابراہیم علیہ السلام
- ارسطو
- افلاطون
- ابنِ خلدون
- ابوبکر صدیق رض
- البیرونی
- ابن بطوطہ
- امیر خسرو رح
- اکبر بادشاہ
- ابوالفضل
- اورنگ زیب
- الزبتھ (ملکہ)
- انیس
- ایڈیسن
- آئن سٹائن
- اقبال رح
- آئزن ہاور
- بُدھ (مہاتما)
- بُقراط
- بنجمن فرینکلن
- بُوعلی سینا
- ٹالسٹائی
- جون آف آرک
- جمال الدین افغانی
- چرچل
- حسین بن علی رض
- حافظ (خواجہ)
- خدیجۃ الکبریٰ رض
- خالد بن ولید رض
- داتا گنج بخش رح
- دانتے
- ڈارون
- رازی رح
- رُومی رح
- ریمبراں
- رونتجن
- رائٹ برادران
- روزویلٹ
- رضا شاہ پہلوی
- زرتشت
- سکندر اعظم
- سقراط
- سعدی رح
- سید احمد خاں
- شارلیمن
- شیکسپیئر
- شیر شاہ سوری
- شاہ جہان
- شا۔ برنارڈ
- صلاح الدین ایوبی رح
- عیسیٰ علیہ السلام
- عمر رض
- عثمان رض
- علی رض
- عائشہ رض
- عمر بن عبدالعزیز رض
- عبدالرحمٰن الاوّل
- عبدالقادر جیلانی رح
- غزالی رح
- غالب
- فاطمہ کبریٰ رض
- فلورنس نائیٹنگیل
- فیریڈے
- قبلائی خاں
- کنفیوشس
- کولمبس
- کارنیگی
- گلیلیو
- گوئٹے
- لوتھر۔ مارٹن
- لیونارڈو۔ دونچی
- لوئی پاسچر
- لنکن
- لینن
- موسیٰ علیہ السلام
- معاویہ۔ امیر
- محمد بن قاسم رح
- مامون رشید
- محمد فاتح
- محمود غزنوی رح
- معین الدین چشتی رح
- مارکوپولو
- محمد علی (مولانا)
- مادام کیوری
- مصطفیٰ کمال
- محمد علی جناح
- نیرو
- نظام الدین اولیا رح
- نیوٹن
- نورجہاں
- نپولین بونا پارٹ
- والٹیر
- واشنگٹن
- ولیم گلیڈسٹن
- ولسن
- ویلز۔ ایچ۔ جی
- ہومر
- ہنی بال
- ہیوگو

مترجم: مولانا عبدالمجید سالک

فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور ۔ راولپنڈی ۔ پشاور ۔ حیدرآباد
قیمت: پانچ روپے۔ سائز و کاغذ: "سو بڑے واقعات" کے مطابق